برزخ
ہاجرہ شکور

(افسانے)

ہاجرہ شکور

افسانے : برزخ
مصنفہ : ہاجرہ شکور
پتا : ۱۷-ذاکر باغ۔ نئی دہلی ۲۵
اشاعت : ۱۹۹۱ء
قیمت : چالیس روپے 40/=
ناشر : انیس امروہوی
تخلیق کار پبلیشرز، ۴-۷، فراش خانہ۔ دہلی ۶
سرورق : انیس امروہوی
کتابت : ایم۔ عمران اعظمی
مطبوعہ : رُوبی آفسیٹ پرنٹنگ پریس۔ دہلی ۶

ملنے کے پتے :

- ○ موڈرن پبلیشنگ ہاؤس۔ ۹ گولا مارکیٹ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی ۲
- ○ ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس۔ گلی وکیل۔ کوچہ پنڈت۔ دہلی ۶
- ○ نور پبلیشنگ ہاؤس۔ فراش خانہ۔ دہلی ۶

TP : 07
HAJRA SHAKOOR
BARZAKH
(STORIES)
TAKHLEEQKAR, DELHI- 1991
Rs. 40/-

والدہ مرحومہ کے نام

# برزخ

ہاجرہ شکور

# تخلیق کار کی مطبوعہ کتابیں

| | | | |
|---|---|---|---|
| پھول جیسے لوگ | (ناول) | انور خان | ۴۰/ روپے |
| یاد بسیرے | (افسانے) | انور خان | ۴۰/ روپے |
| لمحوں کی قید | (افسانے) | کشور سلطانہ | ۴۰/ روپے |
| افسانہ ۸۹ | (افسانے) | مرتب: انیس امروہوی | ۶۰/ روپے |
| موجِ سحر | (شاعری) | (ڈاکٹر) انجنا سندھیر | ۴۰/ روپے |
| قند و زقند | (مزاحیہ) | فیاض احمد فیضی | ۵۰/ روپے |
| برزخ | (افسانے) | ہاجرہ شکور | ۴۰/ روپے |

## آئندہ اشاعتیں

| | | |
|---|---|---|
| نیلام گھر | (ناول) | مشرف عالم ذوقی |
| دھند سے گھرا مکان | (افسانے) | ولی محمد چودھری |
| گھٹتے بڑھتے سائے | (افسانے) | علی امام نقوی |
| اجنبی ساعتوں کے درمیان | (شاعری) | نعمان شوق |
| گنبدِ بے در | (شاعری) | حفیظ آتش امروہوی |
| قفسِ رنگ | (غالب کی حیات و فن کا مطالعہ) | سید قدرت نقوی |
| عظمتِ غالب | (غالب کے فکر و فن کا مطالعہ) | سید قدرت نقوی |
| دو زاویے | (شعری انتخاب) | انیس امروہوی |
| وہ بھی اک زمانہ تھا | (فلمی شخصیات) | انیس امروہوی |

# تخلیق کار پبلیشرز

۱۰۴، فراش خانہ، دھلی ۱۱۰۰۰۶

# ترتیب

# پیش گفتار
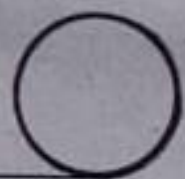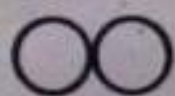
یہ میری کہانیوں کا تیسرا مجموعہ ہے۔ پہلا مجموعہ ۱۹۷۹ء میں "گردشیں" شائع ہوا تھا۔ دوسرا مجموعہ "بند کمروں کی کھلی کھڑکیاں" دسمبر ۱۹۸۷ء میں شائع ہوا۔ مصروف زندگی کی بھاگ دوڑ میں کچھ ہی لمحات اپنی پسند کے کام پر خرچ کئے جا سکتے ہیں۔ یہ تیسرا مجموعہ اُن ہی چُرائے ہوئے لمحات کا حاصل ہے۔ مجھے احساس ہے کہ میری کہانیاں کچھ سوالات پیدا کرتی ہیں، جن کے جوابات ہاتھوں کی پوروں سے بار بار پھسل جاتے ہیں۔ تشنگی کا احساس مصنفہ کی نہیں معاشرہ کی دین ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میری کہانیاں اکثر حالات میں متوسط عورت کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہ کردار اگر آپ کو اپنے گھر میں نہیں تو آس پڑوس میں ضرور ملیں گے۔ اگر وہاں بھی نہیں تو اگلی گلی میں ضرور دیکھ لیجئے گا۔

کچھ لکھنے کے بعد بھی ایک تشنگی کا احساس تو برقرار رہتا ہی ہے، کیونکہ:

ایک کڑوا درد کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں
دل کے تاریک شگافوں سے نکلتا ہی نہیں

یہ کڑوا درد ہی کوڑے مار مار کر اکساتا رہتا ہے۔ یہی دل کے تاریک شگافوں سے راستہ بناتا ہوا کبھی آبشار اور کبھی ندی بن کر بہہ نکلتا ہے۔ یہی دردِ مشترک قاری اور مصنّف کا رشتہ ہے۔

یکم مارچ ۱۹۹۱ء

ہاجرہ شکور
نئی دہلی۔

○○
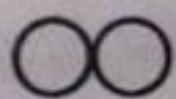
# مدارج

میں ایک عفریت ہوں! ایک خبیث روح! مجھے اندھیرے سے ڈر لگتا ہے۔ میں اندھیرے میں سو بھی نہیں سکتا۔ میں بےچین سی نیند سو بھی جاتا ہوں تو فوراً جاگ اٹھتا ہوں لیکن رات بھر آنکھیں میچے پڑا رہتا ہوں۔ اگر میں اٹھ کر لائٹ جلاؤں گا تو سامنے لگے آئینہ میں میرا عکس نمایاں ہو جائے گا۔ میرا کالکھ پتا چہرہ اور عکس نہ ابھرا تو ــــــ! بچپن میں سنا تھا کہ بھوتوں کے عکس نہیں ہوتے۔ میں بھی تو انسان کے بدلے ایک بھوت ہی ہو گیا ہوں۔ ہر انسانی جذبے سے عاری، یکسر بے رحمی اور خباثت۔ لیکن میری غلطی کیا ہے؟

گوری سے محبت کرنا میری غلطی ہے۔ اُسے فراموش کر دینا! اُسے دوبارہ اپنانا! یا پھر اُسے اپنے گھر سے نکال کر مرنے کے لیے چھوڑ دینا میری خطا تھی۔ یہ ساری ہی خطائیں میری ہیں ــــــ! پہلے تو غور کر لوں کہ گوری کس کا نام ہے۔ اس مفلوج اور دیوانی عورت کے جسم کا جسے چار ماہ پہلے میں کار میں ڈال کر لایا تھا۔ یا اس رس بھری گدراز ہستی کا جس کو میں موتی کہہ کر چڑایا کرتا تھا۔ جس کا سانولا چہرہ محنت کی سرخی سے تمتماتا رہتا۔ بھرے بھرے بازو اور گول چہرہ مجھے دیہاتی حسن سے روشناس کرواتے۔ جس طرح حسن ایک احساس ہے، اس کی کوئی تعریف ممکن نہیں۔ اسی طرح عشق ایک وجدان ہے ــــــ جس کی کوئی تفسیر نہیں کی جا سکتی۔ یہ بھی عشق کا ایک انداز ہے جس میں اپنی محبوبہ کی سڑی ہوئی لاش میں نے باہر پھینک دی۔! یہی حقیقت ہے، کتنی بھی

خوفناک سہی۔ اس سے منہ چھپا کر میں کہاں جاؤں۔ میں نے سوچا تھا وقت کی طنابیں کھینچ سکتی ہیں۔ بیس برس بعد ہی سہی میں آخر کار گوری کا گھر والا رہا ہوں۔ لیکن بیس برس بہت ہوتے ہیں۔ سب کچھ بدل گیا ہے۔ پانی لگاتار بہتا رہتا ہے لیکن پُل کے اوپر کھڑا میں یہ سوچ رہا تھا۔ کہ ندی وہی ہے۔ میں گوری کو بھول نہیں سکتا۔ میں اس گوری کی بات نہیں کر رہا ہوں جس دمیں خود نکال چکا ہوں۔ میں اس گوری کی بات کر رہا ہوں جس سے میں مدھیہ پردیش اور باندہ ضلع کی سرحد پر ایک گاؤں میں ملا تھا۔ جس کو دیکھے دو دہائیاں ہو گئیں۔ گہرے سانولے رنگ اور موٹے ہونٹوں والی وہ حسینہ حُسن کے عام معیار سے بہت الگ تھی۔ اس کے پھٹے ہوئے تلوؤں اور سخت ہاتھوں میں مجھے محنت اور جفاکشی نظر آئی بھنورے جیسے سیاہ بالوں کی اُلجھی لٹیں ماتھے پر پھیلی رہتیں۔ سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی ان دیہاتوں میں کنواری نہیں رہتی لیکن گوری بال ودھوا تھی، وہ کسی اونچی ذات کی نہ تھی۔ اس لیے اس کا کاشت کار باپ اُسکی دوسری شادی کرنا چاہتا تھا۔ میں وہاں انتھروپالوجی کے طالب علم کی حیثیت سے ریسرچ کرنے گیا تھا۔ ہماری اس عدیم المثال نگارِ وطن کے خدوخال دہلی اور بمبئی میں بیٹھ کر کہیں نہیں دیکھے جا سکتے۔ ہندوستان کو دیکھنے کے لیے ضلع باندہ کے اس گاؤں کو بھی دیکھنا پڑے گا، جہاں آنے جانے کا راستہ پگڈنڈیاں ہیں اور یہ راستہ بھی برسات بھر منقطع ہو جاتا ہے۔ میں زندگی کی سچائیوں پر ایک کتاب وہاں لکھنے گیا تھا۔ لیکن وہاں جا کر ایک اور حقیقت واضح ہوئی کہ میں جو بیس سالہ نوجوان تھا اور متوسط گھرانے کا واحد چشم و چراغ تھا۔ وہاں ایک گنوار لڑکی کو دیکھ کر اپنا مستقبل اور ماضی سبھی کچھ بھول گیا۔ مجھے یوں بھی مصنوعات میں لپی پتی اور ساڑی کی کیریز کے لیے محتاط عورتیں قطعی پسند نہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ ساری احتیاطیں اُن کو شیشہ کے حصار میں قید کر دیتی ہیں۔ رعبِ حُسن سے نگاہ تھرتھراتی ہے۔ لیکن شیشہ سے ٹکرا کر واپس چلی آتی ہے۔ یہیں بے جھجک اور بے تکلف گوری سے میری ملاقات ہوئی۔ اُسے دیکھ کر وہ سارے تاثر ختم ہو گئے جو میں نے گاؤں کے بارے میں پُرانی ہندی پکچروں اور ناولوں کو پڑھ کر بنائے تھے۔ شہر کے باشندوں کا خیال ہوتا ہے کہ عورتیں گاؤں میں چاندی کے زیوروں سے لدی پھندی رہتی ہیں ــــــ خوش رنگ لہنگا اور چولی پہنتی ہیں لیکن وہ بھی گاؤں ہے۔ جہاں پوری بستی میں ایک اونی کپڑا نظر نہیں آتا۔ گوری کو میں نے ہمیشہ ایک ملگجی ساڑی میں دیکھا۔ غربت کی گود میں پل کر بھی وہ بے کسی کی تصویر نہیں تھی۔ مجھے اس سے واقعی محبت ہو گئی تھی۔ اس کے چمک دار دانت، موٹے ہونٹ اور مائل

بہ فرزہی سراپا مجھے حسین سے زیادہ حیران کُن نظر آتا۔ اس کو اپنی بیوگی کی پرواہ تک نہ تھی۔ میں اس گاؤں میں دو مہینہ رہا۔ اُن کے پردھان اور زمیندار کا مہمان تھا۔ وہ اُن کے یہاں کام کرنے آتی تھی۔ گاؤں میں قبائلی ماحول کا اثر تھا۔ اس لیے ہم اس بے باکی کی فضا میں ہم خوب گھُل مل کر باتیں کرتے رہتے۔ یوپی اور بہار میں جو منہ چھپانے کا رواج ہے وہ یہاں نہ تھا۔ میں کافی عرصہ تک خود کو یہی سمجھاتا رہا۔ میں اس سے جو بات چیت کرتا ہوں وہ صرف تھیسس کے لیے معلومات اکٹھا کرنے کے لیے ہے۔ ہماری بات چیت معمولی باتوں سے شروع ہو کر گہری باتوں تک پہنچ گئی۔ اس نے اپنے شوہر کو آٹھ سال کی عمر میں ہی کھو دیا تھا۔ موت کے وقت وہ کم سے کم پچیس سال کا تھا۔ اس کی پہلی بیوی موجود تھی۔ گاؤں کی سماجی زندگی کا طالبِ علم ایک خاموش عاشق میں تبدیل ہو گیا۔ اس نے میرا پیغامِ عشق بیباکی اور کھلنڈرے پن سے قبول کر لیا۔ اس کے بعد کی کہانی روایتی انداز سے آگے بڑھی۔ دو مہینے بعد جب میں وہاں سے چلا میرے پاس اس کی یادوں کی دولت، اور اس کے پاس میرے انتظار کا سرمایہ تھا۔ ہم دونوں کے پاس کچھ وعدے بھی تھے۔ کیسی کیسی باتوں کے لیے انسان اتنا سنجیدہ ہو جاتا ہے۔ والدین سے کسی قسم کی حمایت کی اُمید نہ تھی۔ ذات پات، سماج اور معاشی تقسیم ہر قسم کی آزمائش موجود تھی۔ لیکن میں نے ایک خاکہ بنایا تھا۔ میرا خیال تھا کہ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ مکمل کرتے ہی مجھے نوکری مل جائے گی اور پھر مَن مانی کر سکوں گا لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا۔ سب سے پہلے تو میرا مقالہ نامنظور کر دیا گیا۔ وظیفہ بند ہو گیا۔ نوکری بھی دور سے جھلک دکھاتی رہی۔ میں نے گوری کو کوئی خط نہیں لکھا، وہ ان پڑھ جو تھی۔ ہر طرف سے مایوس ہو کر میں مقابلہ کے امتحان میں بیٹھا اور ایک سال کے اندر ہی ذرہ سے آفتاب بن گیا۔ میں ڈیوٹی جوائن کرنے سے پہلے گوری کے پاس جانا چاہتا تھا لیکن تمام مشرقی یوپی سیلاب کی زد میں آ گئی۔ گوری کا دیس تو یوں بھی برسات کے موسم میں جزیرہ بن جاتا ہے۔ ٹریننگ ختم کر کے جیسے ہی میں دہلی آیا تو والدہ صاحبہ پر فالج کا حملہ ہو گیا اور چار ماہ بیمار رہ کر وہ فوت ہو گئیں۔ میں وہاں نہ جا سکا۔ اس کے علاوہ وہاں نہ جانے کا ایک اور سبب بھی تھا۔ میرے دل سے گوری کا تصوّر نکلا تو نہیں تھا مگر لڑکپن کا پیار ایک ہی سال میں مجھے مریضانہ ذہنیت کا ترجمان لگنے لگا تھا۔

کبھی کبھی جب میں نے اپنے بیچ میٹ کی بیویوں یا محبوباؤں کو دیکھا تو مجھے اپنی محبت بڑی گھٹیا نظر آئی۔ میں اپنے متوسط طبقے کی بیک گراؤنڈ سے ہی شرمندہ رہتا تھا۔ گوری کا تصوّر مجھے اپنے

زخموں پر لگے نمک جیسا لگتا۔ لیکن میں بار بار اپنے آپ سے وعدہ کرتا کہ میں وہاں جاؤں گا۔ اس کی معصومیت اور سادگی میں بچھر بھول بھی نہ سکا تھا۔ ایک سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا اور جیسا کہ آج بھی ہوتا ہے مقابلے میں کامیاب ہونے والوں کے لیے شادی کے پیغام ٹوٹ کر برستے ہیں، پتا جی روز نئی لڑکی کی سفارش کرتے لیکن میں مخمصے میں پھنسا ہی رہ گیا۔ ایک دن اچانک دوستوں کے درمیان محبت پر بحث چھڑ گئی۔ میں نے زور شور سے محبت کے لافانی ہونے کے بارے میں دلائل دیئے جن پر میرے دوست بحث کرتے رہے — اسی لمحہ میں نے سوچ لیا کہ میں بہت جلدی گوری کے گاؤں جاؤں گا۔ تیسرے ہی دن میں نے خود کو باندہ کی دہلیز پر پایا۔ بہ ہزار وقت میں دیار یار پہنچا مگر تب تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ گوری کا باپ مر چکا تھا۔ گوری اور اس کی ماں، اس کے نانا کے ساتھ چلی گئی تھیں۔ جہاں کسی ادھیڑ عمر کے آدمی سے گوری کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ یہ تھیں وہ معلومات جو مجھے گاؤں کے پردھان سے ملیں۔ شاید وہ میرا جذبہ سمجھ چکا تھا۔ ایک دن میں اس کے پاس ٹھہرا لیکن پھر میں نے چلنے کا ارادہ کیا۔ انھوں نے بہت خاطر تواضع کے ساتھ مجھ کو روانہ کر دیا۔ چلتے وقت دُکھ تو تھا لیکن اطمینان اور سُبک دوشی کا احساس زیادہ تھا۔ میں کچھ ہلکا ہو کر دہلی واپس آ گیا۔ میرا دل خالی ہو چکا تھا جب میں نے اگنی کنڈ کے سامنے نیلا کا مہندی رچا سنگِ مرمر میں ڈھلا ہاتھ تھاما تو اس میں کسی کی ترغیب یا زبردستی کو قطعی دخل نہ تھا۔ نرگسی آنکھوں اور یاقوتی ہونٹوں والی سرو قد ہمسفر میرے لیے عین مناسب تھی۔ دولت عزت اور مرتبے کے جھولے میں جھولتے ہوئے میں نے تمام یورپ اور مڈل ایسٹ گھوم لیا۔ ہماری ایک ہی بیٹی ہے۔ سویرا۔ ہماری تمام تر اُمیدوں کا مرکز۔ پیچھے مڑنے کی فرصت تو نہ تھی لیکن میں نے مڑ کر دیکھا۔ سویرا پالنے سے اُتر کر کالج جانے لگی تھی۔ ہم پتہ نہیں کب سے پُرانی نسل کے نمائندے بن گئے تھے۔ ایک دن جب میں اسپین میں تھا تو میری آنکھ دیر میں کھلی، رات پارٹی میں دیر تک جاگا تھا لیکن ساری صبح بغیر بیڈ ٹی کے گزر گئی تو پتہ چلا نیلا بستر سے نہیں اُٹھی ہے، کبھی اٹھے گی بھی نہیں۔

میرا دل اتنا ویران ہو گیا کہ میں اپنی اٹھارہ سالہ حسین و شوخ سویرا کو بزنس مینجمنٹ کا کورس کرتے اور ایک کلاس فیلو سے رومانس لڑاتے چھوڑ کر واپس ہندوستان آ گیا —

میں یعنی چھیالیس سال کا چرن داس مِتّل دنیا کا ہر رنگ دیکھنے کے بعد بالکل تشنہ تھا۔ کیسی پیاس تھی جو سرزمینِ وطن میں آ کر اور بھی بھڑک اُٹھی تھی۔ پھر ایک دن میں نے خود کو باندہ میں پایا۔ یہ دو مہینے

پہلے ہی کی تو بات ہے۔ مجھے سب اچھی طرح یاد ہے۔ گوری بھی وہاں ملی مجھے۔ وہ گوری ہی تھی لیکن میرے خوابوں کی تعبیر نہ تھی۔ میں جس احساسِ گناہ سے دور بھاگنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ پوری قوت سے مجھ پر حملہ آور ہوا۔ اُس کے گھنگرالے بال جھڑ چکے تھے۔ رہے سہے راکھ کی رنگت اختیار کر چکے تھے۔ گداز جسم سوکھ کر ڈھانچہ بن چکا تھا چہرے پر پکے جھرّیوں کے جال نے ہر جذبہ ڈھک لیا تھا۔ آنکھوں کی لَو بجھنے والی تھی۔ اس سے بڑھ کر اس کا دماغی توازن لڑکھڑا گیا تھا۔ میں اس بار بھی اس سے پردھان کے گھر ہی ملا۔ پردھان کافی بوڑھا ہو چکا تھا لیکن اُس نے مجھے ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔ وقت کی ندی میرے چہرے کو کچھ زیادہ نہیں دھو پائی تھی۔۔۔۔۔۔!

گوری دوبارہ بیوہ ہو چکی تھی! دوسری شادی کے دو سال بعد ہی وہ بیوہ ہو گئی تھی۔ نانا کے مرنے پر وہ اور اس کی ماں دونوں پردھان کی پناہ میں آ گئی تھیں۔ ماں کی موت کے بعد رفتہ رفتہ وہ پاگل ہو گئی تھی تھوڑا بہت کام وہ اب بھی کر دیتی تھی۔ یوں بھی ساری عمر کام کرنے کے بعد وہ پردھان کے گھر میں گویا پنشن پا رہی تھی۔ اس جیسی تندرست و توانا اور زندگی سے بھرپور عورت کو اس طرح تنہائی میں بیٹھ کر دیواروں سے باتیں کرتے دیکھ کر میرا دل کانپ اُٹھا۔ یہ کیا ہو گیا۔ یہ میری بے وفائی ہی تو تھی۔ کہاں گئی میری دولت اور وجاہت کی ہوس، میں ایک سیدھی سادھی دیہاتی لڑکی سے کیوں کتراتا رہا۔ اسی دوران میں نے وہ انقلابی فیصلہ کر لیا جو ایک طرح کا کفارہ تھا۔ میرا دنیا میں کوئی قریبی عزیز نہ تھا سوائے سویرا کے۔

مجھے کسی کا ڈر نہ تھا لیکن میں ازلی گناہ گار تھا۔ یہ کفارہ مجھے راس نہ آیا۔ میں اس عمر رسیدہ نیم دیوانی عورت کو اپنے پاس رکھنے کے لیے بے چین ہو گیا۔ پردھان نے مجھے اس سے نہ روکا بلکہ ایک باپ کی سی شفقت سے گاڑی میں سوار کروا دیا۔ اس نے یہ ضرور کہا کہ اگر میں گوری کو بھیجنا چاہوں تو واپس بھیج سکتا ہوں۔ گوری کا اس کے گھر پر حق ہے۔ یہ سُن کر میں دل ہی دل میں ہنس پڑا۔

اس وقت میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ کتنی بھی ٹوٹ پھوٹ چکی ہو ہے تو آخر میری محبوبہ ہی۔ میرا گھر تو پورا کا پورا اسی کا ہے۔ آج رات کی اس گھنگھور تاریکی میں سوچ رہا ہوں کہ کیا محبوبہ اور محبت دونوں لفظوں کا مطلب بھی مجھے معلوم ہے؟ میری کار میں گوری کے علاوہ ایک آیا بھی تھی جس کا انتظام میں نے پردھان کی مدد سے کر لیا تھا۔ کار کا سفر شروع ہوتے ہی میرا دل بے کیفی اور پچھتاوے سے بھر گیا۔ گوری برابر کراہ رہی تھی۔ اُس کے اندر سے سیلن بھری بدبو آ رہی تھی۔ یا پھر وجہ یہ تھی کہ آیا برابر اُسے میم صاحب اور

مجھے صاحب کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔ جھنجلاہٹ اور تلخی کی وجہ سے میرا پیر ایکسیلیٹر پر زور سے پڑ رہا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی سڑک پر کار، یوں بھی ہچکولے کھا رہی تھی۔ پچھلی سیٹ کی دونوں عورتیں قلابازیاں کھا رہی تھیں۔ پھر اچانک آیا چلائی۔ "کار روکیے صاحب۔" میں نے کار روک دی۔ کار رُکتے رُکتے ہی گوری نے کھڑکی سے منہ باہر نکال کر قے کر دی۔ سارا ماحول مرے ہوئے چوہے جیسی بدبو سے بھر گیا۔ مجھے خود استفراغ ہونے لگا۔ میں نے یوڈی کولون میں بسا ہوا رومال منہ پر رکھ لیا۔ جی چاہا کہ کار اسی لمحہ واپس موڑ کر دونوں عورتوں کو بردھان کے پاس چھوڑ دوں۔ بہ ہزار دقت آیا نے کار دھوئی۔ گوری بیٹھ کے نیچے نیم بے ہوش پڑی رہی۔ اس کے بعد کار میں نے شہر پہنچ کر اپنے دوست کو واپس کر دی۔ ٹرین میں ہم سب کے لیے ریزرویشن ہو چکا تھا۔ سفر تو جیسا بھی کچھ تھا لیکن یہ احساس کر کے دل ڈوبا جا رہا تھا کہ آگے کیا ہوگا۔ ہم تینوں ایک لمبے سفر کے بعد دہلی پہونچ گئے۔ آخر کار اپنی منزلِ مقصود کی طرف آ ہی چکے تھے۔ پنڈارا روڈ کا سرکاری مکان ہمارا منتظر تھا۔ آج میں اپنے گھر کو ایک نئی نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ گلابی، نیلے اور پیلے پھولوں والا ایرانی قالین، غیر ملکی نوادرات، فرانسیسی پینٹنگ، شاندار سنگِ مرمر کی میز پر پیتل کے گملے میں کیکٹس، گھر کے آگے خوبصورت پھولوں کے حاشیے میں گھرا سبزہ زار۔ اور میرے پہلو میں کھڑی تھی سفید چادر اوڑھے کانپتی کراہتی نیم بے ہوش گوری! اُسے سنبھالنے والی چست و سیاہ فام آیا۔ ان دونوں کے ہونے سے گھر میں کچھ غیر ضروری بھیڑ سی جمع ہو گئی تھی۔ میں نے مہمانوں والا کمرہ گوری کے لیے ٹھیک کروایا۔ پلنگ پر بچھا کٹ ورک کا نفیس پلنگ پوش اُتار لینا ہی میں نے ٹھیک سمجھا۔

ان دونوں کو نہانے دھونے کے لیے کہہ کر میں نے نوکروں کو اُن کے کھانے کے بارے میں ہدایتیں دیں اور چپ چاپ اپنے بیڈ روم میں آ کر بیٹھ گیا۔ سائڈ بورڈ میں ایک ہی فریم میں میری اور نیلا کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ آج نیلا کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں مضحکہ خیز چمک۔ اُس دن میں نے صدقِ دل سے گوری کو ڈاکٹر کے پاس لے جانے کے بارے میں سوچا۔ اگلے دن میں نے اپنے خاندانی ڈاکٹر کو بلوایا۔ وہ میرا پرانا دوست بھی تھا۔ معائنہ کرنے کے بعد اُس نے کہا "آپ کو اپنی پُرانی ملازمہ کا بہت خیال ہے۔ مرض بہت بڑھ چکا ہے۔ مسلسل صدموں نے اُسے دماغی اور جسمانی طور پر بالکل نڈھال کر دیا ہے۔ آپ بہت دن سے باہر تھے شاید اسی لیے اپنی ملازمہ پر توجہ نہ دے سکے۔"

میں خاموش بیٹھا رہا۔ کوئی تردید نہ کر سکا۔ علاج شروع ہوا۔ گوری مجھے تھوڑا تھوڑا پہچاننے لگی تھی،

لیکن اُس کا جگر ماؤف ہو چکا تھا۔ اس لیے جسمانی صحت میں کوئی سُدھار نہیں ہوا۔ وہ میری پرانی ملازمہ سمجھی جاتی تھی۔ میں اُسے چپ چاپ سُن لیتا تھا۔ اُس کو جگہ جگہ تھوکنے کھانسنے اور کھنکارنے کی بُری عادت تھی۔ میں نے کمرے کا قالین ہٹوا دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود سارے کمرے میں بساندسی بھری رہتی ایسی کے سرسے جوئیں بہتیں۔ محبت وحبّت تو نہ جانے کب سے بھولا ہوا خواب بن چکی تھیں۔ اب تو دِل میں ترس اور گھن بھرا نا معلوم ایک جذبہ تھا۔ میں بار بار پرانی گوری اور پُرانی محبت کو یاد کرنے کی کوشش کرتا۔ مگر کچھ ہاتھ نہ آتا۔ اپنے آپ بنایا ہوا یہ شکنجہ مجھے بے دست وپا کر گیا تھا۔ کبھی کبھی مجھے پہچان کر وہ کوئی بات کہہ دیتی تو میرے دل میں کسک کی ایک لہر دوڑ جاتی۔ میں نے محسوس کیا کہ جسمانی طور پر نہ سہی لیکن ذہنی طور پر وہ کچھ بہتر ہوتی جا رہی ہے۔ اچانک مجھے لگا کہ بہتری کی طرف بڑھا اس کا ہر ایک قدم مجھے اُداس کرتا جاتا ہے۔ کیوں ؟ کیا میں اس کو اس طرح مریض دیکھنا چاہتا تھا ؟ نہیں اس کا سبب کچھ اور تھا۔ وہ خیال جو مبہم سا میرے دل میں موجود تھا، اچانک واضح ہونے لگا۔ کراہیت کے جذبہ پر غالب آجانا چاہتا تھا۔ مگر اچانک وہ اس طرح میرے سامنے آیا کہ میں نے خود کو اس کے حوالے کر دیا۔

ایک مہینے تک میں اپنے ذہنی تناؤ سے لڑتا رہا لیکن جب سویرا کا کیبل آیا کہ وہ آرہی ہے تو میں نے اچانک فیصلہ کر لیا کہ یہ غیر انسانی فعل ہی سہی لیکن موجودہ حالت اب اور نہیں چل سکتی۔ میں نے ایک اہم فیصلہ کر لیا تھا اور اس سے پہلے کہ میرا خیال تبدیل ہو میں نے ایک مشنری ادارے سے رابطہ قائم کر لیا اور اپنے رسوخ کو کام میں لاتے ہوئے فوراً ہی داخلہ کی اجازت لے لی ــــــ اگلے دن صبح دس بجے اُن کی وین آئی۔ میں نے آیا کو پہلے ہی حکم دے دیا تھا۔ وین سے ایک نرس اُتری۔ ہم دونوں نے کمرے میں جا کر دیکھا گوری سفید ساڑی پہنے آرام کرسی پر نیم دراز تھی۔ سر کے پیچھے سے قاعدے سے بندھی ہوئی چوٹی نظر آرہی تھی۔ پاؤں میں گلابی چپل تھے۔ آج گوری بہت اچھی اور ایک طرح سے پُرانی گوری لگ رہی تھی۔ میرے دل میں کچھ پگھلنے لگا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "گوری چلو ڈاکٹر کے پاس چلیں۔" میں نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ایک تندرست مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "چلو چرن چلیں۔" مجھے پہچان کر وہ پُرانے لہجے میں بات کر رہی تھی۔ میرا سہارا لے کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں اس کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ آہستہ اُسے باہر لایا۔ پھاٹک کے باہر وین کھڑی تھی۔ میں نے اُسے اندر بٹھا دیا۔ وہ آنسوؤں میں ڈوبی آواز میں بولی "آج اکیلے کیوں بھیج رہے ہو؟" میرے گلے میں کچھ اٹکنے لگا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "تو جا گوری میں کار میں آتا ہوں۔"

میرا ہاتھ پکڑے پکڑے وہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وین ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور میرا ہاتھ چھوٹ گیا۔ میں جیسے کسی بوجھ سے دبا آہستہ آہستہ برآمدے میں آیا، جہاں آیا کھڑی اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ اُسے میں نے گھر میں ہی گھریلو ملازمہ کی حیثیت سے رکھ لیا تھا۔ اس کے آنسو دیکھ کر میں غصہ سے پاگل ہو گیا تھا۔ "رونے کا کیا مطلب ہے" میں نے اُسے ڈانٹا۔ وہ چہرہ صاف کرتی ہوئی کچن کی طرف چلی گئی۔ میں مشینی انداز میں دفتر جانے کے لیے کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ تیسرے دن سویرا آگئی۔ مجھے فوراً پتہ چل گیا کہ وہ کورس اور محبت دونوں میں ناکامیاب ہو چکی ہے۔ وہ بہت اُداس اور دل گرفتہ تھی۔ پھر بھی اُسے دیکھ کر میرا دل بہل گیا لیکن شام کی چائے پر ہی اُس نے ذکر چھیڑا۔

"ڈیڈی وہ کون تھی جو گیسٹ روم میں ایک مہینہ رہی۔ کیا وہ گرینی کے گاؤں کی کوئی عورت تھی۔ آپ کا دل بہت نرم ہے۔ ہر کسی کے لیے آپ کا گھر دفتر حاضر ہے۔" میں نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "بس اب میری بیٹی آگئی ہے۔ اب گھر میں کسی کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ روٹھ کر بولی "آپ بھی کن دو کوڑی کے لوگوں کے ساتھ میرا مقابلہ کرتے ہیں۔ میں کچھ نہ کہہ سکا۔ میرا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ سویرا نے کچھ دھیان دیے بغیر دوسرا ذکر چھیڑا۔ "ڈیڈی سیمی کتنا کمینہ لڑکا تھا۔ کہتا تھا کہ ہندوستانی لڑکیوں سے شادی نہیں کی جا سکتی۔ ساتھ رہنے اور دوستی کرنے کی بات الگ ہے۔ کہاں اسپین اور کہاں ہندوستان۔" اُس کی آواز رندھ گئی۔ میں سمجھ گیا کہ سویرا کے دل میں گہری چوٹ پہونچی ہے لیکن سیمی کے لیے میرے دل میں غصہ نہیں بھرا۔ میں پتہ نہیں کیوں سوچنے لگا۔ صاف گوئی کا یہ انداز کاش کہ ایک نسل پُرانا ہوتا۔

بزدلی گنہ گار کو کتنا گرا دیتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ انسان بھی نہیں رہتا عفریت بن جاتا ہے۔

# اَن کہی

زندگی کے چھبیس برسوں میں ہوش سنبھالنے کے بعد سارے فیصلے ہم نے آپ ہی کیے۔ نہ معلوم کونسا فیصلہ غلط ہو گیا۔ زندگی شطرنج کی بساط تو نہ تھی، جس میں ہر چال فیصلہ کُن ہوتی ہے، لیکن وہ اندھا جوا بھی نہ تھی۔ خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو خدا اور قسمت کو مانتے ہیں۔ ہر چیز کا الزام کسی اوپر والے پر لگا کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔

سنا ہے انسان کو بنانے بگاڑنے میں گھر کے ماحول کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے لیکن جن کا خاندان نہیں ہوتا وہ بھی تو کچھ نہ کچھ بن ہی جاتے ہیں۔ ہمارے ملک میں لوگ بہت ماضی پرست ہوتے ہیں، لیکن میرا ماضی تو کچھ بچھو کی طرح ڈنک مارتا نظر آتا ہے۔ ماضی میں دھرا ہی کیا ہے۔ ماں کی، باپ کی شکلیں دُھندلی سی یاد ہیں۔ سنتے ہیں والد کسی مسجد کے امام تھے۔ غریبی اور خیرات پر ہی ہماری زندگی کی بُنیاد رکھی گئی تھی۔ گھر میں ہر وقت بیماری اور غریبی کا ماحول رہتا تھا۔ ٹوٹے پھوٹے سامان اور ڈھیلے پلنگوں سے بھرا ہمارا ایک بے رونق گھر تھا۔ جس کی دیواریں دھوئیں سے کالی ہو رہی تھیں۔ سدا بخار سے تپتی ہوئی ماں کے پاس اگر ہم بیٹھ جاتے تو خواہ مخواہ تپش محسوس ہوتی۔ ماں کی آخری یاد یہ ہے کہ بخار کی گرمی ختم ہو گئی۔ وہ برف کی طرح ٹھنڈی ہو گئیں۔ اس وقت میں چار سال اور آپی بارہ ۱۲ کی تھیں۔ اسی دن ہم نے نہ صرف والدہ کی بلکہ والد صاحب کی صورت بھی آخری بار دیکھی۔ والد صاحب

فقیری لے کر کہیں چلے گئے۔ نمازِ جنازہ کے بعد اُن کو کبھی نہیں دیکھا گیا۔ انھیں والدہ سے اتنی محبت تو نہ تھی کہ وہ مجنوں بن جاتے لیکن بیوی کے انتقال کے بعد وہ جبریہ شادی کے بندھن سے آزاد ہو گئے وہ ہمیشہ دُرویشی کی طرف راغب تھے۔ دل و دماغ سے وہ متاہلانہ زندگی میں فٹ نہیں ہوئے تھے۔ ہماری زندگی میں یوں بھی کون سی راحت تھی۔ اب تو زندگی بالکل جہنم زار بن گئی تھی۔ ہم دونوں بچیاں اسی نیم تاریک گھر میں اپنے مجذوب باپ کا انتظار کرتی رہ گئیں۔ ہمارے رشتہ دار شاید کوئی ہوں، لیکن ہمارا دعویدار کوئی پیدا نہ ہوا۔ آخر کار مالکِ مکان نے ہم دونوں کو یتیم خانے میں داخل کروا دیا۔ ہماری زندگی کا آسرا ہو گیا۔ اس کا مکان خالی ہو گیا۔

جو کچھ بھی ہوا اگلے پانچ سال اسی بے رنگ و بو ماحول میں گزر گئے۔ جہاں زندگی بس ایک معمول تھی۔ ویسے ہم دونوں نے گھر کو کبھی بھول کر بھی یاد نہیں کیا۔ یہاں کسی بیمار کی مسموم اور کسی نیم دیوانے کی جھڑکیاں نہ تھیں بعد میں میں نے کتابوں میں پڑھا کہ ماں باپ کا رشتہ بہت پیارا ہوتا ہے۔ میرا اپنا تجربہ اس کے بالکل برعکس رہا ہے۔ "ماں" لفظ کے ساتھ بے زاری کا اور "باپ" کے نام کے ساتھ خوف کا احساس میرے دل و دماغ کو جھنجھوڑ دیا کرتا تھا۔ بس میں اور آپی ہی ایک دوسرے کے لیے سب کچھ تھے۔ لیکن اب اُن کا سہارا بھی کہاں رہ گیا ہے۔ حالات ایک جیسے تھے لیکن دونوں پر اثر کتنے مختلف انداز میں ہوا۔ غموں نے آپی کو جلا کر راکھ بنا دیا اور مجھے ایک مجسم شعلہ۔ وہ مجسم انکساری بن گئیں، محنتی خاموش اور سنجیدہ، اور میں لڑاکا بدزبان اور خود پسند۔ لیکن آج انھوں نے اپنی ساری زندگی کی خاموشی کا بدلہ لے لیا ہے۔ میری تند گفتاری سرنگوں ہے۔

سرکاری آشرم میں آپی نے میٹرک پاس کیا، ٹائپ سیکھی۔ اچانک کسی نہ کسی طرح اُن کو دو سو روپیہ ماہوار کی نوکری مل گئی۔ ہم دونوں بہنوں کو خوش ہونا آتا ہی نہ تھا حیرت ضرور ہوئی۔ نوکری کرتے ہوئے آشرم میں رہنا ممکن نہ تھا۔ ہماری انچارج نے ہمیں ایک چھوٹی سی کوٹھری کرایہ پر دلوا دی اور ہم نے اس وسیع دنیا میں ایلومنیم کے پتیلے، اسٹوو اور ایک ٹوٹے پھوٹے بکس کے ساتھ گھر گرہستی شروع کی۔ سترہ سال کی آپی گھر کا مرد بن گئیں اور گرہستن بھی۔ میں اُن کی لاڈلی اکلوتی بہن اپنا بھولا ہوا بچپن یاد کرنے لگی۔ آپی نہ جانے کس مٹی کی بنی تھیں۔ کبھی بھی کوئی ارمان نہ جاگا۔ کپڑوں کا مطلب تن ڈھانک لینا۔ اور کھانے کا مطلب پیٹ بھر لینا۔ یہ اُن کی زندگی کا محور رہا۔ وہ دن کو نوکری کر کے شام کو پڑھا کرتیں،

انھوں نے کسی نہ کسی طرح ایم۔اے کر لیا۔ اُن کا دل بالکل بجھ سا گیا تھا۔ نہ کوئی خوشی نہ غم۔ اُن کے برعکس میں اب تک کی تمام کلفتوں کا ازالہ کرنے کے لیے ہر خوشی اور مستی کو اپنے اندر سمیٹ لینا چاہتی تھی۔ میرے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی آپی بڑی بہن کے بدلے ماں بن گئیں۔ میں قبول صورت تیز طرار لڑکی کے روپ میں بڑھ کر جوان ہو گئی۔ زندگی کی ہر خوشی میں صرف اپنے لیے چاہتی تھی۔ میں آپی سے محبت کرتی تھی لیکن وہ بھی ایک حد تک۔ بی۔ اے کے بعد میں نے یونیورسٹی جوائن کر لی۔ مخلوط تعلیم نے مجھے بیحد فیشن ایبل اور بے باک بنا دیا تھا۔ ایم۔ اے آپی نے بھی کیا تھا مگر پرائیویٹ۔ ایم۔ اے کے بعد اُن کی ہیئت میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ صرف عینک کا اضافہ ہوا تھا۔ لیکن میں بند قبا ہی توڑ کر بھاگ جانا چاہتی تھی۔ میری کلاس کے لڑکے مجھ میں دلچسپی لیتے تھے لیکن مجھے سہل الحصول چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے پسند آئے بھی کون پروفیسر علی امام۔ پروفیسر صاحب ان چار پانچ برسوں میں کچھ بھی تبدیل نہیں ہوئے ہیں۔ اُن کی آنکھوں پر بدستور نیلگوں چشمہ فٹ ہے، قد ان کا تاڑ کی طرح سیدھا ہے بازوؤں کی سکڑی ہوئی کھال اور نیلگوں رگیں اُن کو فکر و پختگی کا پیکر بنا دیتی ہیں۔ اندازِ گفتگو میں شفقت اور نفاست کے ساتھ مخصوص ہمہ گیریت بھی ہے۔

وہ ہمیشہ سے ہی مجھے بچی سمجھتے تھے۔ وہ قریب آئے مگر وہ لمحے جھونکوں کی طرح نکل گئے۔ وہ پھر سے میرے ہر انداز کو بچپن سمجھنے لگے۔ کیوں — ؟ انھیں ایک پختہ اور سنجیدہ عورت جو نظر آ گئی ہے۔ ان دنوں پروفیسر اکیلے ہی رہتے تھے۔ کلاس کی لڑکیوں کے ساتھ کئی بار میں اُن کے گھر گئی۔ اور کسی نہ کسی بہانے میری دیوانہ وار چاہت اُن پر عیاں ہو گئی تھی۔ شاید وہ بھی مجھے پسند کرنے لگے۔ ہماری جان پہچان کے دوسرے سال انہوں نے مجھ سے صاف صاف کہہ دیا۔ صابرہ میں عمر میں تم سے بہت بڑا ہوں۔ اب سے دس برس بعد بھی تم جوان ہو گی اور میں اس وقت بھی بڑھاپا محسوس کر رہا ہوں۔ تم ویسے بھی اپنی عمر سے زیادہ الھڑ ہو۔ میں تمھیں پسند ضرور کرتا ہوں لیکن اگر تم اپنی دیوانگی سے باز آ جاؤ تو میں بھی اپنے جذبات کو آسانی سے قابو میں کر لوں گا۔

خدا جانے کیوں میں نے اس جملہ کو اظہارِ محبت سمجھا۔ یاد نہیں اُس کا جواب میں نے کیا دیا۔ ہاں یہ ضرور ہوا کہ ہماری شادی طے ہو گئی۔ وہ ڈیپارٹمنٹ میں مجھ سے عام سا برتاؤ کرتے تھے لیکن میں چاہتی تھی کہ ہر شخص کو پتہ چل جائے کہ ہم کتنے قریب ہیں۔ میں چاہتی تھی کہ کلاس میں ہی اُن کی باہوں میں باہیں ڈال کر

جھول جاؤں۔ ناچوں گاؤں لیکن اُن کی طبیعت کی بُردباری میرے دل کی ترنگوں کو ہمیشہ روکتی رہی۔ آخرکار وہی ہوا کہ سیشن ختم ہوتے ہوتے سب کو معلوم ہوگیا کہ عنقریب ہماری شادی ہونے والی ہے۔

آپی کو بھی معلوم ہوا لیکن انھوں نے اس سلسلے میں کوئی اظہارِ خیال نہیں کیا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ دلچسپی لیں اور پروفیسر کے بارے میں معلوم کریں لیکن یہ سب نہیں ہوا۔

بحرحال جون کے ایک سُونے سے دن ہماری شادی ہوگئی۔ ہمارے ٹوٹے پھوٹے کرائے کے گھر میں بارات نہیں آئی۔ ہم دونوں بہنیں پروفیسر صاحب کے گھر کچھ روز قبل شفٹ ہو گئے تھے۔ آپی نے ایک ہزار روپیہ خرچ کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اس شادی سے خوش نہ تھیں لیکن وہ بالکل خاموش رہیں۔

شادی ہوگئی۔ آپی واپس پُرانے گھر میں چلی گئیں۔ پروفیسر صاحب کے کاٹج نما گھر میں اب ہم دونوں تنہا تھے۔ ایک ہی ہفتہ میں مجھے ایک قسم کی کوفت نے گھیر لیا۔ پروفیسر صاحب بہت عمر رسیدہ تھے۔ اُن کی خوشیاں اور غم ہی مختلف تھے۔ وہ مجھے خوبصورت لگتے۔ میں انھیں تکتی رہتی۔ وہ پریشان سے ہوجاتے۔ میں چاہتی کہ نئی نویلی دُلہن کی طرح سجی دھجی رہوں۔ میں نت نئے کپڑے زیور پہن کر آتی لیکن اُن کی زبان سے تعریف کا کوئی کلمہ نہ پھوٹتا۔ پکچر، پارٹی، ہنگامہ ہر چیز سے انھیں کوفت تھی۔

جبکہ میں قحط کے مارے انسان کی طرح دنیا کی ہر لذت پر ٹوٹ پڑنا چاہتی تھی۔ میں نے نیا نیا بیڈمنٹن کھیلنا سیکھا تھا۔ میں کلب جانے کی ازحد شوقین ہوگئی لیکن انھیں اسٹاف کلب اور یونیورسٹی کی سیاست کے تذکروں سے وحشت ہوتی تھی۔ میں اُن سے اکثر بور ہوجاتی تھی۔ لیکن یہ آزادی خود مختاری اور مالی فراغت کی فضا جو مجھے اُن کی بدولت میسر آئی تھی وہ میرے لیے بہت معنی رکھتی تھی۔ ہم دونوں کچھ خوش تھے، کچھ ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجموعی طور پر زندگی کچھ ایسی بُری نہ تھی۔ وہ سنجیدگی اور خاموشی سے سب کچھ سہہ جانے اور نبھانے کے عادی ہوگئے تھے۔ کون جانتا ہے کہ ہم دونوں کچھ دن بعد آئیڈیل جوڑا بن جاتے لیکن اسی دوران ایک معمولی سا حادثہ ہوگیا۔ آپی جس گھر میں ایک مدت سے رہتی تھیں وہ ازحد شکستہ ہوچکا تھا۔ برسات میں ایک کوٹھری کی چھت گر گئی اور آپی کا کمرہ مخدوش قرار دے دیا گیا۔ میں نے پروفیسر سے ڈرتے ڈرتے اظہارِ خیال کیا۔ یوں تو میں اُن سے کبھی اپنے ماضی گھر خاندان اور رہائش گاہ کا کبھی بھول کر بھی تذکرہ نہ کرتی تھی۔ یہ سب اُن کے معیار سے بہت نیچے کی چیز تھی۔ لیکن اُس وقت میں ٹال نہ سکی۔ میں نے آپی کو فوراً اپنے گھر بلانے کے لیے کہا۔

وہ اُسی رات ہمارے گھر آگئیں، جب تک مالک مکان پوری طرح مرمت نہیں کرادیتا، انھیں ہمارے

پاس ہی رہتا تھا۔ شروع شروع میں ان دونوں کی ملاقاتیں صرف کھانے کی میز پر ہی ہوتی تھیں۔ پھر آپی کی خاموشی میں کمی آئی۔ وہ مسکرانے بھی لگیں۔ اُن کا کھانے کی میز پر بیٹھنے کا وقت بڑھنے لگا۔ ہر طرح کے شک دل میں آتے لیکن میں ظاہر کر کے اُن کے وقار کو مجروح نہیں کر سکتی تھی۔ آپی نے نئے سرے سے زندگی میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔ بہت جلد کئی مشترک موضوع بھی انھوں نے ڈھونڈھ لیے۔ سدا کی خاموش اور سہمی سہمی سی آپی پُر زور انداز میں اپنے دلائل پیش کرتیں۔ میں حیران رہ جاتی کہ ان آپی کو میں نے کبھی دیکھا کیوں نہیں تھا۔ بنجر زمین میں پودا ٹھٹھر جاتا ہے لیکن آبیاری کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ بارش کی پہلی بوند کے ساتھ ہی کوئی ننھی سی کونپل نمودار ہو کر زندگی اور حرارت کا اعلان کرتی ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپی کے بجھے دل کو ابرِ نیساں کا یہ قطرہ میرے گھر سے ملے گا۔

میں لمبی تھی۔ شادی کے بعد موٹی بھی ہو گئی تھی، لیکن آپی دُبلی اور چھوٹی تھیں۔ چہرے کی کھال مُرجھا گئی تھی۔ لیکن آج کل شوخ کپڑوں میں ایک دم جوان لگنے لگی تھیں۔ اِن سب باتوں سے نہیں بلکہ میں اُن کے نہ ختم ہونے والے مباحثوں اور تبادلۂ خیال کے دور سے ایک دم چونک گئی۔ وہ دونوں اپنی باتوں میں اتنے کھو جاتے کہ میرا وجود ہی بھول جاتے۔ میرے ساتھ پروفیسر صاحب نے کبھی ایسی کھُل کر بات نہیں کی۔ میں اُن کی اسٹوڈنٹ تھی اور ہمیشہ اسٹوڈنٹ ہی رہی۔ وہ میری باتوں کو بچپن کی بے ضرر حماقتوں کے سوا کچھ نہ سمجھتے تھے۔

کئی مہینوں سے یہ کھیل میرے سامنے چل رہا ہے۔ آپی غیر محسوس طریقے پر اُن کی محبوبہ بنتی جا رہی ہیں اور میں بیوی کی بہ نسبت بے چہرہ جسم زیادہ بنتی جا رہی ہوں۔ میرا یہ الزام وہ دونوں کبھی نہیں مانیں گے لیکن میں جانتی ہوں پروفیسر کے لیے ذہنی تسکین کا ایک اور منبع ہے۔ آپی نیلے پیلے اور نارنجی غرارے پہننے لگی ہیں اور پروفیسر کا پسندیدہ سبز رنگ بھی استعمال کرنے لگی ہیں۔ آج اس سبز غرارے میں تو وہ کافی خوبصورت اور کم عمر نظر آ رہی تھیں۔ جب آپی نہا رہی تھیں تو نہ جانے کس دھن میں میں نے پروفیسر سے کہا۔

سنیے۔! ابھی جوان ہیں کیوں نہ آپ اپنے دوستوں میں کوئی مناسب میچ دیکھیں۔" وہ اخبار سے نظریں ہٹا کر بے خیالی میں بولے۔ ہاں! لیکن کون سمجھ پائے گا اُن کی خوبیوں اور قدر و قیمت کو!"۔۔۔ وہ خواب ناک لہجے میں بول رہے تھے۔ وہ اپنے آپ ہی سے مخاطب تھے۔ بے سوچے سمجھے انھوں نے قبول ہی دیا کہ ان جیسا قدر داں آپی کو اور کون ملے گا۔ آپی آج نہیں تو کل چلی جائیں گی۔ لیکن اُن کا سایہ ہمیشہ کے لیے ہمارے درمیان رہ جائے گا۔ پروفیسر کے خواب و خیال پر اُن کی حکمرانی ہوگی۔ میرے

حصے میں خاموشی ہی آئے گی۔ یہ ڈرامہ ایسا ہے جس میں خاموش آپی کا کردار مجھے مل گیا ہے میرے اور پروفیسر کے درمیان جو کھائی تھی آپی نے اپنی مسکراہٹوں کو پھاوڑے کی طرح استعمال کر کے اُسے خوب چوڑا کر دیا ہے۔

# وصالِ یار

"یہ جو میں ہوں، کیا یہ صرف میں ہی ہوں ؟ یا کوئی اور ہستی میری ذات پر قبضہ جما چکی ہے ؟ یہ بھی میں ہوں جو یہی بات سوچ رہا ہوں اور یہ بھی میں ہوں جو کسی اور ہستی کے اندر سما جانے کا مسئلہ پیدا کیے ہوئے ہوں۔ میں ہمیشہ یہ سوچتا رہا کچھ حدود میں رہ کر زندگی کا لطف اُٹھانا بُری بات نہیں۔ میں اپنے آپ کو بُرا آدمی نہیں سمجھتا، مگر آدرش وادی بھی نہیں بننا چاہتا۔ میرا فلسفہ ہے کہ جو موقع اپنے آپ چل کر سامنے آئے اُس کا فائدہ کیوں نہ اٹھایا جائے۔ میں آج اگر ایک کامیاب انسان، کامیاب ڈاکٹر ہوں تو شاید اسی وجہ سے۔ میں نے کسی کو دھوکا نہیں دیا اور سچ بول کر مجھے کچھ نقصان نہیں ہوا۔ لیکن آج سے پہلے میں خود کو اتنا نیک نہیں سمجھتا تھا۔ جو بھی حقیقت ہے وہ ہی میرے لیے اہم ہے۔ جذبات دوسرے درجے پر آتے ہیں۔ میں سائنس کا طالب علم ہوں۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے۔ میری نیکی کا کیا سبب ہے ؟ میری بیوی چترا، میری بیٹی رچنا ؟ متوسط طبقے کی اخلاقی قدریں ؟ پھر ایک پیارا سا چہرہ جسے ماہ و سال کی گرد نے دھندلا تو دیا ہے مگر بھلایا نہیں۔ مسز برگینزا کو بھلایا ہی نہیں جا سکتا۔ میں انھیں کیسے بھلا سکتا ہوں ؟ جو میری آنکھوں میں بصارت بن کر، دماغ میں شعور بن کر اور روح کے ساتھ ضمیر بن کر ہمیشہ میرے ساتھ رہیں۔ انھوں نے مجھے صحیح راستہ دکھایا تھا۔ اگر آج میں نے سبھی کو وہی راستہ دکھایا ہے تو یہ میں نہیں بلکہ میرے اندر کی "وہ" سامنے آ گئی ہیں۔ میرے اندر اُن کا کچھ حصّہ شامل ہے۔ جو آج بہت کارگزار نظر آتا ہے۔

سر بھی کوئی بھٹکتی ہوئی لڑکی نہیں۔ دراصل ایک عمر ہوتی ہے دیوانگی کی، عشق میں فنا ہو جانے کی، ایک جان لیوا آمیزش محسوس کرنے کی۔ اس عمر کے بعد یہ حسین طوفانی ترنگ غائب ہو جاتی ہے۔ باقی بچتا ہے صرف حساب کتاب۔ یعنی کیلکولیشن اور اُس کے بعد ساری زندگی جمع اور تفریق کے سوال کرتے ہوئے ہی گزر جاتی ہے۔

وہ صرف ایک مختصر سا دور ہوتا ہے جب انسان اپنے نقصان میں لذت پاتا ہے اور نقصان کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ اٹھارہ سال کی سُر بھی کا بھی یہی زمانہ ہے۔ میں اُسے راستہ دکھا چکا ہوں یا یوں کہیے کہ بس ایک ہلکی سی رہ نمائی کی ہے۔ آگے کا راستہ وہ خود تلاش کرے گی۔ مناسب وقت پر اُسے ایک اور عشق ہوگا۔ وہ طوفانی ممکن ہے نہ ہو مگر پائیدار ہوگا۔ محبت کا جو خونِ رنگ گلاب اُس نے بڑی عقیدت اور محبت اور بھگتی سے مجھے پیش کیا تھا۔ میں نے اس کے ہی بالوں میں ٹانک دیا تھا۔ کل کوئی اور یاد آئے گا اس کا صحیح حقدار۔ وہ آ کر اُسے خود ہی نکال لے گا۔ جو سبق میں نے پڑھا تھا وہ آج میں پڑھا سکنے کے قابل ہوں ــــ کیوں کہ سر بھی گذشتہ کل کے پرشانت کا عکس ہے اور آج کے ڈاکٹر پرشانت میں پُرانی مسز برگینزا کا روپ ہے۔

محبت کا سُرخ گلاب کبھی میرے دل میں بھی کھلا تھا۔ میں نے اُسے ایک دیوی پر چڑھایا بھی تھا۔ لیکن وہ پتھر کی مورتی نہ تھی، جس کے پاس جواب کے نام پر مہیب خاموشی کے سوا کچھ نہ ہو۔ شربتی آنکھوں اور سنہرے بدن والی وہ شربتی دلربا شیکسپیئر کے ڈراموں کا ہیروئن کا تصوراتی پیکر نہ تھی۔ وہ تھیں جینفر برگینزا۔ پینتیس ۳۵ سال کی اینگلو انڈین عورت۔ ادھ کھلی کلی کی اپنی الگ نزاکت ہے، مگر سہ پہر کے گلاب اور پچھلے پہر کی چاندکی اپنی ہی ادا، اپنا ہی گداز ہوتا ہے۔

اُن دنوں تپ دق بہت خطرناک اور موذی مرض سمجھا جاتا تھا۔ میں امیر ماں باپ کا اکلوتا لڑکا تھا۔ رومان پسند اور ضدی۔ ہونا تو نہیں تھا، مگر نہ جانے مجھے کیسے پلوریسی ہو گئی۔ کچھ ایسی بداحتیاطی ہو گئی کہ پھیپھڑوں میں بھرا پانی نکلنے کی جگہ جمتا گیا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹروں نے پھیپھڑوں پر دھبے بتا دیے۔ دل پر پتھر رکھ کر ماں باپ نے مجھے ہاسپٹل میں داخل کرا دیا۔ چیڑ کے درختوں سے گھرا اور سبزہ زاروں کے حصار میں بند سینی ٹوریم مجھے بہت عنبر دلچسپ لگتا تھا۔ جب تک رشتہ دار ملنے کے لیے آتے رہتے میرا دل بہلتا رہتا۔ اُن کے جاتے ہی تنہائی میں میری تکلیف دوگنی ہو جاتی۔ ادھیڑ عمر کی بھیانک صورت نرس کو دیکھ کر مجھے جلاد کا خیال آتا۔ میں وہاں رہنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ نرس خشمناک نگاہوں سے گھور کر مجھے دیکھتی اور کہتی۔

"ڈاکٹر برگینزا ہی تمہیں ٹھیک کرے گی ـــ وہ انگلینڈ سے آنے ہی والی ہے۔"

اپنے واپس آنے کے دو دن بعد ڈاکٹر برگینزا نے ڈیوٹی جوائن کر لی۔ دس بجے کے قریب وہ میرے پاس آئیں۔ میں ڈاکٹر کا منتظر تو ضرور تھا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ ڈاکٹر برگینزا ایک سرو قد حسینہ کا نام ہے۔ وہ کمرے میں داخل ہوئیں تو اکتوبر کا وہ روشن دن کچھ اور پُر نور ہو گیا۔ اونچی ایڑی کی محراب میں رکھے ہوئے وہ سُبک پاؤں، آسمانی ساڑی کی لہریں اور اُن کے اُوپر سفید کوٹ۔ اخروٹی بالوں میں سورج کی کرنیں اُلجھ رہی تھیں۔ تنری بتیلیوں میں ہلکی سی شرارت انگیز ہنسی پوشیدہ تھی۔ ذرا موٹے گلابی ہونٹوں میں جگمگاتے ہوئے ہیرے پنہاں تھے۔ سفید فاموں میں اتنے چمکدار دانت کم ہی ہوتے ہیں۔ میں حیرت زدہ تھا۔ کیونکہ میری توقعات کے برعکس ڈاکٹر برا گینزا نہ صرف عورت تھیں بلکہ آدھی سفید فام ہونے کے باوجود انھوں نے ساڑی پہن رکھی تھی۔ بعد میں میں نے انھیں طرح طرح کے لباسوں میں دیکھا۔ لیکن میں نے پہلی ہی ملاقات میں اپنا دل پورے خلوص کے ساتھ اُن کی نذر کر دیا تھا۔ جی ہاں، میں نے، جو اس وقت صرف سترہ سال کا تھا۔

انھوں نے آتے ہی میری طرف دیکھا۔ پھر ذرا مسکرا کر چارٹ کی طرف جھک گئیں۔ میں انھیں ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔ اُن کی آنکھوں کے چاروں طرف عمر کا پنچھی ہلکے سے پنجے گاڑ گیا تھا۔ وہ ہلکی سی لکیریں اُن کی شخصیت کو ایک دل آویز نرمی بخش رہی تھیں۔ اُن کا حسن شعلہ فشاں نہ تھا بلکہ بادل میں چھپے چاند جیسا پُر سکون اور خنک تھا۔ ایسی عورتوں کے ہونٹ نہیں قدم چومے جاتے ہیں۔ وہ میرے پاس آئیں تو انھوں نے میرے ہاتھ کو تھام کر گرمی محسوس کی۔ پھر نبض دیکھی۔ اُن کے ہاتھوں میں ممتا بھری نرمی تھی۔ اُن کی پتلی مخروطی انگلیاں اور ہلکی گلابی جلد والا دُبلا سا ہاتھ۔ میں بھی کیسا سودائی تھا کہ کبھی اس ہاتھ کو تھامنے کی تمنّا کر بیٹھا تھا۔

وہ روز میرے پاس آتیں۔ اپنے ہاتھ سے انجکشن لگاتیں۔ کڑوی سے کڑوی دوا اُن کے اشارے پر آنکھ بند کر کے پی لیتا۔ وہ کبھی تیوری پر بل ڈال لیتیں تو میری جان پر بن جاتی۔ میں جانتا تھا کہ اُن کا غصّہ مصنوعی ہوتا ہے۔ مگر میں پھر بھی ڈرتا تھا۔ وہ ذرا بھی ناراض ہوتیں تو جھلملاتے ہوئے موتی گلابی قاشوں کے پیچھے چھپ جاتے۔ میں اُن کی ہنسی پر فدا تھا۔ وہ جتنی دیر میرے پاس رہتیں، میں انھیں ہنسانے کی کوشش کرتا۔ دنیا کی شاید ہی کوئی عورت ہو جو مرد کی لگاوٹ بھری نگاہ کو نہ سمجھ سکے۔ مرد کی پُر شوق نگاہیں اُس کی چھٹی حس کو بیدار کر دیتی ہیں۔ ڈاکٹر برگینزا بھی سمجھ گئیں مگر اُن کی توجّہ میں کوئی کمی نہ آئی۔ چھ ماہ اسی جنت میں گزر گئے۔ چھ ماہ بعد جب میں ٹھیک ہونے لگا تو اچانک یہ اندیشہ سامنے آ گیا کہ ٹھیک ہوتے ہی میں اس سینی ٹوریم سے نکال دیا جاؤں گا۔ پھر کیا ہوگا؟ جینیفر سے دور رہ کر صحت میرے لیے لاحاصل تھی۔

بہت سوچ سمجھ کر ایک دن میں نے اُن سے حالِ دل کہنے کا فیصلہ کیا۔

روز کی طرح وہ میرے پاس دس بجے کے قریب آئیں۔

اس دن کسی وجہ سے موٹی بدمزاج نرس اُن کے ساتھ نہیں تھی۔

"کیسے ہو، چھوٹے لڑکے؟" انھوں نے مسکراتے ہوئے انگریزی نما ہندوستانی میں کہا۔ "اچھا ہوں لیکن "اچھا ہونا نہیں چاہتا" میں نے ضدی لہجے میں جواب دیا۔ "کیوں؟" انھوں نے چارٹ دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے بہت سنجیدگی اور بُردباری سے جواب دیا۔ "آپ سے دور نہیں جانا چاہتا۔ میں نے ہمیشہ آپ کا قرب چاہا ہے۔ میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔ میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" میں اچانک یہ سوچ کر چپ ہو گیا کہ میرا لہجہ رٹے ہوئے سبق کی طرح غیر جذباتی سا ہو گیا ہے۔ دراصل اس عمر میں شادی کا خیال خود مجھے بھی بے تکا سا لگتا تھا۔ میں اُن کا جواب سننے سے پہلے ہی کھسیانا ہو گیا تھا ——— وہ مطلق حیران نہیں ہوئیں۔ اسی پُرسکون لہجے میں بولیں "میں بھی تم کو بہت چاہتی ہوں۔ پر شانت تم ہو بھی تو بہت پیارے گڈے۔ اتنے چھوٹے سے تو ہو۔" انھوں نے اپنے دونوں ہاتھوں کے بیچ میں ایک بالشت جگہ چھوڑ دی۔ "نہیں ڈاکٹر! میں اتنا چھوٹا نہیں۔ پانچ فٹ سات انچ کا پورا مرد ہوں۔" میں نے بچی کھچی خود اعتمادی سمیٹتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ انھوں نے غیر ملکی تلفظ والی انگریزی میں جواب دیا۔ "تم میرے مریض ہو عزیز لڑکے!" اور میرے اپنے بیٹے سے کچھ زیادہ بڑے نہیں۔" میرے سر پر پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ میں نے اب تک انھیں بیوہ یا طلاق شدہ سمجھا تھا۔ انھوں نے میرے پاس بیٹھ کر بہت سی پیاری پیاری باتیں کیں۔ باتوں باتوں میں انھوں نے بتایا کہ اُن کے شوہر فوج میں کرنل ہیں اور اُن کے دو بچے مسوری میں پڑھتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ یہ لگاؤ یا عقیدت جسے نوعمر لڑکے لڑکیاں محبت سمجھ لیتے ہیں، کوئی مجرمانہ یا شرمناک بات نہیں ہے۔ اُن کی میٹھی دلنواز باتوں نے میری ندامت کو دھو دیا۔ میں خود کو بہت ٹھیک محسوس کر رہا تھا۔

کچھ دن بعد جب میں ٹھیک ہو گیا تو ایک دن انھوں نے مجھے الوداع کہا۔ میری زندگی کا ایک باب ختم ہو کر دوسرا شروع ہوا۔ میں نے پڑھنا شروع کیا۔ اُن کا آدرش میرے سامنے رہا۔ میں نے ڈاکٹری کی تعلیم مکمل کی تب ہی میری زندگی میں چترا آئی۔ اور ایم۔ ایس کرنے کے بعد میں نے چترا سے شادی کر لی اور روایتی انداز میں اپنی زندگی اور پیشہ میں جم گیا۔ میں مسز برگینزا سے اکثر ملتا جلتا رہتا تھا۔ شادی کے

ایک سال بعد میں رچنا کا باپ بنا۔ میری خوبصورت بچی۔ آج وہ چودہ سال کی ہے اور سربھی وہ شکل سے اٹھارہ کی ہوگی ـــــ سربھی میری وہ مریضہ ہے جس میں مجھے اپنے عنوانِ شباب کی تصویر نظر آتی ہے۔ جس نے میرے اندر مسز برگینزا کو بیدار کر دیا ہے۔ سربھی بہت خوبصورت ہے۔ بہت ذہین ہیں البتہ تو خبز ضرور ہے۔ چمپئی اُداس چہرہ۔ کالی آنکھیں۔ وہ مریض تھی۔ برانکائٹس کا شکار۔ وہ میری مریض تھی۔ وہ بھی اس مرض میں مبتلا ہوگئی، جس سے میں کبھی صحت یاب ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک مسکراہٹ ـــــ روز بروز واضح ہوگئی۔ مجھے یقین ہے کہ میرا پیغامِ محبت مسز برگینزا کے لیے لطیفہ کے سوا کچھ نہ ہوگا، لیکن میں مسز برگینزا نہیں ہوں اور ایک مرد کے لیے ایسی تحریض سے دامن بچانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ جب کہ چترا ابھی آج کل بیوی کی نسبت ماں زیادہ بن گئی ہے۔ زندگی میں جو بھی خلا ہے۔ اس کو بھرنے کے لیے میں شاید تیار ہوجاتا لیکن آخر کار میں اس آزمائش میں پورا ہی اُترا۔ سربھی میرے اندر سما جانا ہی چاہتی تھی۔ میرے سر کے بالوں سے جو تجربہ جھانک رہا ہے وہ اتنا تو بتا ہی رہا ہے کہ عورت کی محبت کی تکمیل خود سپردگی میں ہوتی ہے اور مرد ہوس کی تکمیل کے لیے اُسے بڑھاوا دیتا ہے۔ میں نفس کو کیسے زیر کر سکا۔ شاید مجھے اپنی عمر، نیک نامی اور چترا کا خیال تھا۔ شاید رچنا اور سربھی عمر کی اور قد و قامت کی مماثلت سامنے آگئی تھیں یا شاید اور کبھی کا لیا ہوا قرض اتارنے کے لیے میرا رُواں رُواں بیقرار تھا۔ میں سربھی کے دل سے احساسِ ندامت کو تو مٹا نہ سکا، کیونکہ میں مسز برگینزا کی طرح ہنرمند نہیں تھا اور شاید میرا ضمیر بھی اتنا صاف نہ تھا لیکن سربھی کی زندگی ضرور برباد ہونے سے بچ گئی۔ اُس کی عمر بھی پختہ کاری کی طرف ایک قدم آگے بڑھ گئی۔

مجھے صرف یہ خوشی ہے کہ میں جنیفر کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ آج انھیں رگِ جاں سے بھی قریب محسوس کر رہا ہوں بلکہ یہ کہنا مناسب ہوگا کہ میں اپنی ہستی میں اُن کا جلوہ دیکھ رہا ہوں۔

# سنگِ دل

زندگی ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب کوئی نہ پوچھ سکا۔ ہر انسان کی زندگی ایک نیا سوال ہے۔ اس کا جواب نہ کوئی ڈھونڈتا ہے نہ کسی کو ملتا ہے۔ بس زندگی رواں دواں گزرتی ہی جاتی ہے۔ سوال کی فرصت ہی کسے ہے لیکن شکنتلا کے ساتھ ایسا نہ تھا۔ اس نے ہر شام سوال پوچھنے میں گزار دی۔ لیکن ہر سوال لاجواب رہا۔ اب وہ تشنہ کام سوالات گردشِ ایام میں دبنے لگے تھے۔

شکنتلا بوڑھی ہو چلی ہے لیکن بچپن اور جوانی میں گلابوں سے جو عشق تھا وہ زندگی کے اڑتالیس سال گزارنے کے باوجود بدستور برقرار رہا ہے۔ زندگی کی ساری خوبصورتیوں کو دل کی گہرائیوں سے پیار کیا ہے۔ گلاب کے ہر رنگ کے پودے مونالیزا کی تصویر۔ برآمدے کے گوشے میں بیت کا فرنیچر نفیس انگلش کراکری شکنتلا کو اور اس کی ہر اُیٹم کو ہینڈل و دیکھ کی ضرورت ہے۔ نزاکت کے ساتھ مضبوطی بھی ہے۔ زندگی کے گھمسان رن اکیلے ہی لڑ کر جیت لیے۔ اگرچہ اس کی قیمت بھی زبردست دینی پڑی۔ روز شام کو وہ لان میں بیٹھ جاتی ہے۔ بہت سے خیالات کے ساتھ آسیم کا خیال بھی آجاتا ہے۔ شاید وہ اپنے آپ کو مٹی بنا دیتی اور قبر میں زندہ دفن کر دیتی لیکن کانتا اُس کی چھوٹی بہن اُس کی رہنمائی کرنے آگئی۔ انجینئرنگ پڑھنے والی آزاد خیال لڑکی نے اُسے بتا دیا کہ اُس کی طلاق سے چھوٹی بہنوں کا مستقبل برباد نہیں ہوگا۔ دراصل شادی مستقبل ہے ہی نہیں۔ ایک حیوان نما انسان کے ساتھ رہنے میں کوئی

تیاگ نہیں ہے۔ بہنوں کا خیال کرنے کی وجہ سے اُسے خود پر یہ ظلم کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دراصل یہ زندگی شرمناک ہے۔ طلاق نہیں۔ وہ اپنا سوٹ کیس اُٹھا کر آ گئی جہیز میں ملے فرنیچر اور زیورات کا بھی کوئی خیال نہیں کیا۔ اس نے اپنی پُرانی نوکری پھر سے حاصل کرلی۔ ایم۔ ایس۔ سی اور بی ایڈ تو تھی ہی۔ اس نے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ بھی کرلی۔

شام زندگی میں قدم رکھتے ہی اُسے یہ احساس ہوگیا کہ کوئی کچھ کہے اُس نے لاشعوری طور پر اسیم کا انتظار ہی کیا ہے۔ کبھی وہ واپس آئے گا، کبھی وہ معافی مانگے گا۔ پھر کیا ہوگا؟

لیکن اب عمر ایک موڑ پر آ چکی ہے۔ اب اڑتالیس واں سال بھی ختم ہو چکا ہے۔ ماں بننے کا سُکھ اب کبھی نہیں ملے گا۔ اب تک وہ ایک خود فریبی کا شکار رہی تھی۔ کام کم ہوتا تھا اور جسم ہر وقت تھکاوٹ کا شکار رہتا تھا۔ اتنی تھکن کہ بولنے اور پلکیں کھولنے میں بھی مشقت محسوس ہوتی تھی۔ آج اُس کا دُبلا جسم اتنا نحیف و ناکارہ ہو چکا ہے کہ گارڈن چیر میں دھنسا ہوا، بڑھتی ہوئی شام کی تاریکی کا ایک جزو معلوم ہوتا ہے۔ پُرانی نوکرانی آ کر دو ایک بار جھانک چکی ہے۔

شکنتلا وہ ہی بات سوچ رہی ہے جو وہ بہت بار سوچ چکی ہے۔ یہ شادی کے بعد ہی اُسے پتہ چلا کہ اسیم شراب اور سگریٹ میں ڈوبا ہوا بگڑے ہوئے کردار کا نوجوان ہے۔ وہ کسی غیر ملکی فرم میں اُونچے عہدے پر فائز تھا۔ وہ جہاں تھا وہاں شراب اور شباب سے بھرپور پارٹیاں ہمیشہ ہوتی رہتی تھیں۔

بات ایک یا دو دن کی نہیں تھی۔ بنیادی بات یہ تھی کہ اُن کے درمیان محبت کا رشتہ تھا، نہ عزت کا صرف جسمانی رشتہ قائم کرنا۔ شکنتلا کو طوائفیت سے کم نہیں لگتا تھا۔ ایک دن جب اسیم نے شراب کے نشے میں ہاتھ اٹھایا تو اس نے مزید گھٹن برداشت کرنا بے معنی سمجھ لیا اور وہ گھر چھوڑ کر "فوراً" واپس آ گئی۔ اس نے وہ مقام ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ جہاں وہ فرنیچر کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنی ٹوٹی ہوئی شخصیت کو جوڑا۔ دھیرے دھیرے زندگی مہربان بھی ہوئی۔ آخر کار جیون ساتھی کے علاوہ اُسے سب کچھ مل گیا۔ جوانی گذر گئی لیکن ہر قدم پر کچھ سوال پوچھتی ہوئی۔ اسیم ایک دن پچھتائے گا۔ ایک دن واپس آئے گا۔ ایک انتظار کا سلسلہ تھا جس کا کوئی سرا نہ ملتا تھا۔ وہ دیوداس نہ تھی۔ اس نے خود کو تباہ نہ کیا۔ اس نے اپنے اکیلے کے لیے ہی سہی ایک خوبصورت کوٹھی نما گھر بنوایا۔ گلابوں اور چنبیلی سے

سجالان نازک انگلش کراکری فرنیچر پردے اور کتابیں اُسے ہر چیز کا شوق تھا۔

وہ بھائی اور بہن کے بچوں میں گھری رہی۔ یہاں تک کہ لان خراب کر دینے والے اور گھر گندا کر دینے والے بچے تو جوانی کی حدود میں داخل ہو گئے۔۔۔۔ شکنتلا کی آنکھوں میں حلقے پڑ گئے لیکن انتظار کی جوت نہ بجھی۔ بالوں پر برف پڑ گئی لیکن زلفیں کسی کے دستِ شوق سے لگائی گئی ایک کلی کا راستہ دیکھتی رہیں۔ شریر بچوں کی تخلیق کا جسم کے نشیب و فراز کا انتظار ہی رہا، یہاں تک کہ اڑتالیسویں سالگرہ آ گئی۔ راہ گزار غبار آلود ہو گئی۔ اب کبھی جسم کو تخلیق کا کرب نہیں جھیلنا ہوگا۔ بس اب انتظار کے چراغ بجھا دینا ہی ٹھیک ہے۔ لیکن آج کی رات کچھ زیادہ ہی تاریک تھی۔ کائنات سکتے میں تھی۔ بڑھاپے کی دہلیز پر کھڑا دماغ موت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اب ایم کا نہیں موت کا انتظار تھا جو لاحاصل ثابت نہیں ہونے والا تھا کہ پھاٹک پر آہٹ ہوئی۔ ایک سایہ اندر داخل ہوا۔ بے شمار بے خواب راتوں کو جس کی دستک کا انتظار تھا۔ آج بغیر دستک کے ہی آ پہنچا تھا۔ موتی دُم ہلا کر غرّانے لگا لیکن شکنتلا کے ہاتھوں کے لمس سے چُپ ہو گیا۔ "شکن" ایم کی آواز ہمیشہ کی طرح بلغم زدہ اور بوجھل تھی۔ "آؤ بیٹھو" شکنتلا نے یوں کہا کہ وہ روز ہی آتا ہوگا۔ "کیسے آنا ہوا؟" اُس نے بغیر تمہید کے کہا "میں تمہیں لینے آیا ہوں ـــــ "کیوں کس ادھیکار سے؟" شکنتلا کی آواز بالکل سپاٹ تھی۔ "تم میری بیوی ہو"۔ اُس نے والہانہ انداز میں کہا۔ "بیوی" شکنتلا نے سحر زدہ آواز میں کہا۔ اچانک اُسے اس لفظ کی گہرائی کا اندازہ ہوا۔ اب وہ ماں نہیں بن سکتی۔ بیوی بننا بھی بے معنی ہے۔ اور رفاقت کا مطلب بھی صرف یہ ہے کہ آدھی رات کو شراب کے نشے میں دُھت شوہر کو اٹھا کر پلنگ پر ڈالنا۔ جوتے کھولنا اور چادر اُڑھانا۔ صبح کو ناشتہ دینا اور دن بھر لاحاصل انتظار کرنا۔ کس قدر خوفناک زندگی ہے۔ اسے اس کی ضرورت نہیں۔ اب اُسے تحفظ اور بدنامی کی بھی پرواہ نہیں۔

وہ اس اگنی پریکشا سے نکل آئی ہے۔ جوانی کے تپتے ہوئے خارزار کے بعد اب بڑھاپے کی سرحد پر یہ کیسا سراب مل گیا ہے۔ اُس سے دامن بچا کر ہی نکل جانا ہوگا۔ جب تک گھنیری زلفیں تھیں وہ ایک کلی کے لیے ترستی رہیں۔ اب سفید ہو کر جھڑتی ہوئی زلفوں کو یہ کو نسا دیوزاد پنجہ کانٹوں بھرا تاج پہنا رہا ہے۔ "تمہیں چوبیس ۲۴ سال بعد یاد آیا کہ میں تمہاری بیوی ہوں۔ اب تم مجھے کیا دو گے؟ بچے نہ گھر کا سکون۔ مجھے اب تمہاری ضرورت ہی کیا ہے۔" اُس نے ایم کے چہرے پر آنکھیں گاڑ کر کہا۔

بوڑھے سنولائے چہرے پر گناہوں کی داستان لکھی تھی۔ اب جبکہ تم صحت اور پیسہ گنوا چکے ہو تو تمہیں میری ۔۔۔ ہے، کیونکہ تمہیں پناہ کی ضرورت ہے۔ جہاں سے تازہ دم ہو کر نکلنے کے بعد تم مجھے پھر ایک بار ٹھکرا سکو۔ تمہیں میری نہیں میرے بنائے ہوئے گھر کی ضرورت ہے۔" ایم یہ دو ٹوک باتیں آنکھیں پھاڑے ہوئے سن رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شکنتلا نے دوسری شادی نہیں کی۔ اپنی زندگی سے اپنے مرد کا نام بھی نکال دیا۔ وہ ایسم کے نام پر بیٹھی رہی۔ لیکن اب یہ کیسی بے رخی تھی۔ اس نے ہمت کر کے کہا "شکن" "یہ شوہر و بیوی کا بندھن جنم جنم کا بندھن ہے" "یہ یوں نہیں ٹھکرایا جا سکتا۔ ہر پرائی عورت کو دیکھ کر رال ٹپکانے والا اور شراب پی کر اوندھے منھ نالوں میں گرنے والے انسان نے کب اس کی پرواہ کی تھی ــــ" آج جب پچپن سال کی عمر میں تم بے حد بدنامی کیساتھ وقت سے پہلے ریٹائرڈ کر دیے گئے ہو تو تمہیں میری یاد آئی۔ تم میرے سکون میں آگ لگانے چلے آئے۔ نہ تمہارے پاس رہنے کے لیے گھر ہے نہ معاشی تحفظ۔ تم کچھ دینے نہیں بلکہ اپنا حق جتا کر لینے آئے ہو۔ تم مجھے میرے چوبیس سال واپس کر دو گے۔ میری گود میں کوئی بچہ ڈال سکو گے۔ تم کچھ نہیں دے سکتے۔ تم شرمندہ ہو کر نہیں بلکہ اپنا حصہ وصول کرنے والے سود خور کی طرح آئے ہو۔ تم نے مجھے گھر سے نکال دیا تھا۔ آج میں تمہیں گھر سے نکال رہی ہوں، موتی انھیں پھاٹک تک پہنچا دو۔" موتی کھڑا ہو کر بھونکنے لگا۔ معافی اور تلافی کی طویل تقریر ایسم کے منھ میں ہی رہ گئی۔ موتی اُسے پھاٹک تک کھدیڑ آیا۔

پرانی نوکرانی برآمدے میں ساکت کھڑی تھی۔ نصیحت کے الفاظ اس کے دل ہی میں رہ گئے۔ وہ اپنی مالکن کا ٹھوس اور بے حس چہرہ دیکھتی ہی رہ گئی۔

# جیون لیلا

کئی بنیادی سوال ہمیشہ جواب سے محروم رہتے ہیں۔ ہر انسان اپنے طور پر اُن کا کوئی جواب فرض کر لیتا ہے۔ ایسا ہی ایک سوال ہے۔ سماج انسان کے تابع ہے یا انسان سماج کا غلام ہے؟ انسانی رشتے جسمانی قربت سے پیدا ہوتے ہیں یا دماغی تعلق اور دنیاوی رشتوں سے؟ شرومنی نے اس کا جواب دیا ہے وہ کتنا سچ ہے اور کتنا غلط۔ واضح کوئی بات نہیں ہے۔ دُھندلے دُھندلے سے خیالات ہیں۔ شرومنی کو کبھی میں پسند کرتا تھا۔ ناپسند تو آج بھی نہیں ہے لیکن ایک مختصر سے وقفے کے لیے میں نے اُسے جیون ساتھی بنانے کے خواب ضرور دیکھے تھے۔ وہ لڑکی ہی ایسی تھی۔ میں بدذوق نہ تھا جو اُس کے جادو سے بچ سکتا۔ صاف اور سیدھے الفاظ اور سُلجھے ہوئے نظریات اس کی بائیس سالہ جوانی کی پختگی کا رنگ بخشتے تھے۔ وہ میری زندگی کا مقصد نہ تھی لیکن میرا خواب ضرور تھی۔ میں اس پر نرمی اور شائستگی کا رعب ڈالنا چاہتا تھا لیکن دراصل میں بھی سڑک چھاپ مجنوں ہی تھا۔ اپنی کم ہمتی جس کو میں خواہ مخواہ اس کی منگنی کی خبر سے جوڑتا رہا۔ مجھ کو غم و غصہ سے دیوانہ بنا گئی۔ انتقام کے جوش نے مجھے وہ حرکت کرنے کے لیے اکسا دیا جس کی مجھے اپنے آپ سے اُمید نہ تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ حادثہ گیا بیتا ہو گیا لیکن نہ جانتا تھا کہ زہر کے بیج کا پودا پھوٹ چکا ہے۔ آج چار سال بعد اُس سے ملنے کے بعد میرے جذبات خود میرے لیے اجنبی بن گئے ہیں۔ پتہ نہیں میں خوش ہوں یا دُکھی۔ اسٹیشن سے واپسی پر یہی سب کچھ میرے دماغ میں گھوم رہا ہے۔

چار سال پہلے ہم دونوں ایک ہی جگہ ملازمت کرتے تھے۔ اُس نے انگریزی ادب میں ایم۔ اے پاس کیا تھا وہ مترجم کا کام کرتی تھی اور میں سیکشن آفیسر تھا۔ ہم روز ہی ملتے تھے۔ لیکن کچھ دنوں بعد سرکاری نوعیت کی ملاقاتیں ذاتی رنگ میں رنگی جانے لگیں۔ میں نہ جانے کیوں یہ سمجھنے لگا کہ میں اس کے دل میں جگہ پانے لگا ہوں۔ ایک دن جب میں اس سے صاف بات کرنے ہی والا تھا تو میں نے محسوس کیا کہ آج کچھ خاص بات ہے۔ خوبصورت گلابی ساڑی میں لپٹا ہوا سراپا۔

پہلی کے چاند کی پہلی کرن کی طرح جگمگاتے اور نازک حُسن کی وہ تصویر آج بھی ذہن میں زندہ ہے۔ پانچ بجے تک میں اسی اُدھیڑ بُن میں لگا رہا۔ دفتر بند ہونے کا وقت آ گیا۔ وہ بھی اپنی چیزیں سنبھالنے لگی۔ باہر اسٹول پر افیون کا عادی چپراسی بیٹھا رہ گیا۔ تنہائی پا کر میری ہمت بڑھی۔ میں نے بہت غور و فکر سے ترتیب دیا ہوا یہ فقرہ ادا کر دیا ــــ شرومنی تمہارے خوبصورت ہاتھوں میں ایک انگوٹھی کی کمی ہے۔ میں یہ کمی پوری کرنا چاہتا ہوں۔ تم ایک دن میری بڑی بہن کے گھر چلنا وہ تم سے مل کر بہت خوش ہوں گی"۔۔۔ " سر! آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی! کہیں یہ اظہارِ محبت تو نہیں ہے؟ میں نے آپ کو اس نظر سے نہیں دیکھا اور آپ کو شاید پتہ نہیں کہ آج ہی صبح میری منگنی ہو چکی ہے۔ دو ہفتے بعد شادی ہو جائے گی۔ کل پرسوں تک سب کو دعوت نامے مل جائیں گے۔

اس کے الفاظ سے زیادہ اس کا سپاٹ اور بے نیاز لہجہ میرا خرمنِ ہوش و خرد جلا کر راکھ کر گیا۔ محبت کھونے سے زیادہ بے غیرتی کا پاگل کر دینے والا احساس۔ میں ہمیشہ کا شریف مہذب اور رکھ رکھاؤ والا، نہ ٹوٹنے والا انسان، شیشے کی طرح جب ٹوٹا تو چور چور ہو گیا۔ اکتوبر کی پیدائش کی وجہ سے نظریات میں عقرب کا اثر غالب آ گیا۔ میں اپنی توہین کا انتقام لینے کے لیے تیار ہو گیا۔ بجلی کی سی تیزی سے میں نے باہر کھلتے ہوئے دروازے کی چٹخنی لگائی۔ باہر اسٹول پر افیمی چپراسی بیٹھا رہا۔ اندر کے نیم تاریک کمرے میں۔ اس شیطان کا راج ہو گیا جو ہر انسان کے قالب میں رہتا ہے۔ عظیم الشان سرکاری عمارت کا وہ حصّہ بالکل سنسان تھا۔ میرا ذہن دماغ سوچ رہا تھا کہ عورت کے ساتھ محبت جتانے اور اپنانے کا جو طریقہ ہے وہی اُس سے انتقام لینے کا بھی ہے۔ یہ قدرت اور معاشرے کا کیسا کھیل ہے۔ آگے کہانی مختصر ہے۔ آدھے گھنٹے بعد جب چوکیدار اندر آیا کہ دفتر بند کرے تو میں اکیلا تھا پتہ نہیں کب شرومنی جا چکی تھی۔ میں جیسے اپنے آپ کو بھولا ہوا ایک کرسی پر پڑا تھا۔ شرومنی پھر دفتر نہیں آئی۔ اُس کا استعفیٰ آیا جس پر کسی کو تعجب نہیں ہوا۔ کیونکہ شادی کے بعد نوکری چھوڑنے کا فیصلہ وہ پہلے ہی سنا چکی تھی۔

دس دن بعد یہ خبر آئی کہ اُس کی شادی ہو گئی ہے۔ کلکتہ سے بارات آئی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔

میں ذہنی الجھنوں اور پچھتاوے کے درمیان راستہ ڈھونڈتا رہا۔ میں اندر ہی اندر بالکل ٹوٹ گیا تھا۔ اُداس دل لیے ایک مہینہ کی چھٹی لے کر میں اپنے گاؤں چلا آیا۔ وہاں میں پاگلوں کی طرح بے مصرف پھرتا رہا، کھیتوں میں گھومتا رہتا۔ منڈیر پر بیٹھے کلی کو پھول بنتے دیکھتا رہتا۔ نہ جانے کیا سوچتا رہتا۔ دن گزرتے گئے۔ گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھتی رہیں، لیکن میرے لیے وقت ٹھہر گیا تھا۔ وہ آنکھیں وہ دو آنکھیں جن میں نفرت سے زیادہ حیرت بھری تھی۔ میرے اعصاب پر سوار ہو گئیں۔ حالت ایسی ہو گئی کہ اماں جھاڑ پھونک پر اُتر آئیں اور والد صاحب نے بڑے بھائی کی معرفت دماغی ماہرین سے مشورہ لینے کی ضرورت سمجھی۔ میرے رہنے کا بندوبست بڑی بہن جی کے گھر کر دیا گیا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے بچے مجھے ہمیشہ گھیرے رہتے۔ میں ٹھیک ہوا لیکن ٹیس باقی رہ گئی۔ یہ درد اور تڑپ ہی اس جبریہ تعلق کی یادگار تھے۔ لیکن میں نہ جانتا تھا کہ ایک اور نشانی بھی موجود ہے۔ وقت نے میرے نام کے آگے تجربہ جوڑ دیا۔ انڈر سیکریٹری ہو گیا۔ دفتر بدل گیا بلکہ منسٹری بھی بدل گئی۔ میری زندگی سُدھر چلی تھی۔ میں ہمیشہ سے چہل قدمی کا عادی تھا۔ جنگ پورے میں رہنے کے باعث اکثر نظام الدین اسٹیشن تک پیدل ہی آجاتا تھا اور آج تو میں پھر ایک دوست کو لینے آیا تھا۔ لیکن کیا پتہ تھا کہ گردشِ ایام پیچھے کی طرف گھوم جائے گی۔ میرا دوست تو نہیں آیا لیکن جبل پور سے آنے والی گاڑی سے وہ اُتری۔ وہی بالکل وہی شرومتی۔ فرق بس اتنا تھا کہ چار سال پہلے آخری بار جب دیکھا تو وہ گلابی لباس میں تھی اور آج آسمانی پھولدار ساڑی میں موسم سرما کا پورا کھلا ہوا گلاب میرے سامنے تھا۔ مانگ میں سندور کی ہلکی سی لکیر اُسے ایک محتاط فاصلے پر پہنچا رہی تھی۔ ہاتھ میں چھوٹا سا سوٹ کیس، بوجھ کی وجہ سے کمر کے خم کو واضح کر رہا تھا۔ میں چاہتا تو اُسے نظر انداز کر دیتا ــــ میرے دل کے اندر بیٹھا ہوا چور اُس کے سامنے جانے سے کترا رہا تھا۔ وہ جبل پور سے آنے والی گاڑی سے اُتری تھی۔ میں کسی کو لینے آیا تھا۔ میرا وہ دوست تو نہیں ملا لیکن شرومتی سے ملاقات ہو گئی۔ میں اُسے نظر انداز نہ کر سکا۔ خدا جانے کیوں اس کے پاس بڑھا چلا آیا۔ شاید معافی مانگنے۔ تجدید محبت کی غلطی کرنے یا پھر محض تجسس کی خاطر۔ وہ پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ اُس کی بھٹکی ہوئی نگاہ میرے اُوپر پڑی۔ "کیسی ہو شرومتی؟" بے شمار باتیں جو میں کہنا چاہتا تھا، اُن کے بدلے صرف یہ کہہ سکا "آپ کی مہربانی ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بات کر رہی تھی لیکن وہ مجھے طنز آمیز محسوس ہوا۔ "تمہارے شوہر کیسے ہیں؟" مرضی کے بغیر میں نے پوچھا۔ "وہ جبل پور میں ہی ہیں۔ چھوٹی بہن کی شادی تھی۔ اس لیے میں جلد چلی آئی۔ وہ، ماں جی، اور ہمانشو ایک دو ہفتے بعد آئیں گے۔" وہ سادگی سے بات کر رہی تھی۔ بات کرتے کرتے ہم

پلیٹ فارم سے باہر نکل آئے۔

"شرومتی! میں تم سے کتنا ملنا چاہتا تھا۔ تم مجھے بے حس، بے شرم سمجھو گی لیکن میں سچ مچ تم کو خوش اور مطمئن دیکھ کر بہت ہلکا محسوس کر رہا ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ میری غلطی نے تمہاری زندگی تباہ نہ کی" میں بہت خلوص سے کہہ رہا تھا۔ سریندر جی! جس کو آپ غلطی کہہ رہے ہیں، وہ ایک ایسا آتش فشاں تھا جس میں میری روح تک جل گئی۔ میں اُسے کبھی نہیں بھول سکتی۔ زندگی بھر کے لیے ایک یادگار ساتھ ہے" وہ جوش میں بولتی چلی گئی۔ باتوں کی دُھن میں ہم ایک اُجڑے ہوئے پارک میں چلے گئے۔ چاروں طرف ٹریفک تھا لیکن ہم ان سب سے دور جا چکے تھے۔ اچانک میرے دل میں ایک نیا خیال آیا "کیسی یادگار" میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔ "کوئی اور یہ نہ جان سکا لیکن میں جانتی ہوں۔ ہمانشو آپ کا ہی بیٹا ہے اگرچہ میرے دل میں آپ کی کوئی عزت نہیں لیکن میں جانتی ہوں آپ مجھے بلیک میل نہیں کریں گے ——— اور کریں بھی تو مجھے اس کا کوئی خوف نہیں ہے۔ سیمر کو دنیا کی کوئی طاقت میرے خلاف نہیں بھڑکا سکتی" میرا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں سینتیس ۳۷ سال کا کنوارہ مرد اچانک خود کو باپ محسوس کر کے خوف زدہ ہو گیا۔ "کہاں ہے ہمانشو میں اس سے ملنا چاہتا ہوں" میں نے اچانک کہہ دیا۔ پھر زبان روک لی۔

"ہمانشو! آپ کی غلطی اور حیوانیت کا نتیجہ ہی سہی لیکن آپ اُس کے باپ نہیں۔ میرا بیٹا کسی جانور سے رشتہ نہیں رکھتا۔ وہ سیمر جیسے بلند انسان کی شخصیت کا پرتو ہے" صاف اور سیدھی بات نشتر کی طرح دل میں اُتر گئی۔ کیا تم اُسے ٹھیک سمجھتی ہو۔ کہ سیمر دوسرے بچے کو اپنا بچہ سمجھ کر پرورش کیے جا رہے ہیں۔ تم نے انھیں نہ بتا کر بہت بڑی غلطی کی" میں اُن کو بتاتی بھی تو کیا ——— اگر مجھے ذرا بھی یہ احساس ہوتا کہ آپ کی یہ غلطی ایک سوالیہ نشان بن کر سامنے آئے گی تو میں یہ شادی نہ ہونے دیتی۔ لیکن ایسا نہ ہوا۔ شادی کے فوراً بعد ہی میں نے محسوس کیا ——— کہ یہ ——— ظلم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد میں کر ہی کیا سکتی تھی۔ اُن کے دماغ میں کبھی ایک پل کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ یہ بچہ اُن سے نہیں ہے۔ حقیقت بیان کرنے سے کسی کو سُکھ نہ ملتا۔ اُن کا دماغی سکوت غارت ہو جاتا اور میں اور ہمانشو شاید لاوارث رہ جاتے" "تمہارا ضمیر تم کو کیسے چین لینے دے رہا ہے سیمر کے ساتھ تم دھوکہ کر رہی ہو" میں نے پُر زور الفاظ میں کہا۔ "کیسا دھوکہ؟ کیا ماں باپ کا رشتہ صرف جسمانی ہوتا ہے؟ جسم آدمی حقیقت ہے اور سماج پوری" باپ بیٹے کا رشتہ سماجی ہوتا ہے۔ یوں بھی یہ آدمی سچائی کس کا بھلا کرتی۔ میری اس حرکت کو خود غرضی سمجھا جا سکتا ہے لیکن

جوابیت نہیں۔ آپ کبھی ہمانشو سے ملنے یا حق جتانے کی کوشش نہ کریں۔ پہلے ہم کلکتہ میں تھے۔ پھر جبل پور چلے گئے۔ دلی کبھی کبھار آنا ہوتا ہے۔ آج آپ سے ملاقات ہوگئی۔ مجھے آپ سے نفرت نہیں کیونکہ آپ کی وجہ سے میرا کچھ بگڑا نہیں۔ سماج میں بھی میرا مقام برقرار رہا۔ یہ مکاری نہیں بلکہ ایڈجسٹمنٹ ہے۔ مجبوریوں سے سمجھوتا اور نفع نقصان کے درمیان توازن، میرا ضمیر مطمئن ہے۔"

وہ اپنا سوٹ کیس اٹھا کر چلنے لگی۔

"جب میں تمہارے لیے اتنا حقیر ہوں تو تم نے مجھے یہ سب کیوں بتایا؟" میں نے وہ سوال پوچھا جو میں کتنی ہی دیر سے سوچ رہا تھا۔۔۔۔ "آپ سمجھے نہیں۔" اُس نے مڑکر میری طرف دیکھا۔ ایک زہریلی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں کے کناروں پر کوندگئی۔ "یہ میرا انتقام ہے۔ آپ نے مجھے ساری زندگی کے لیے بوجھ دیا تھا لیکن میں نے اُسے موتیوں کے ہار کی طرح گلے میں ڈال لیا۔ اب میں نے اصلیت بتا کر جو تڑپ دی ہے اُسے آپ گلے کا ہار نہ بنا سکیں گے۔ پھر بھی یہ دکھ آپ کو زندگی بھر ڈھونا ہوگا ــــ وہ سڑک پر آگئی۔ ایک ٹیکسی کو رُکوا کر اُس میں بیٹھ گئی۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ ہلکا آسمانی سراپا برق کی طرح چمک کر غائب ہوگیا۔ میں وہیں بیٹھا رہ گیا۔ نہ جانے کیوں مجھے انتقام کے جام میں کھٹ مٹھا ذائقہ آ رہا تھا۔

✣ ✣ ✣

# حفاظتی باندھ

ہر سال ندی میں سیلاب آتا ہے۔ ہر سال اس پر باندھ باندھا جاتا ہے، لیکن کبھی کبھی سیلاب اتنا تیز ہو جاتا ہے کہ باندھ کو بھی بہالے جاتا ہے۔ میں نے تو یوں ہی ایک بات کہی ہے۔ مجھے کسی سیلاب کا انتظار نہیں ہے لیکن باڑھ کے خیال کے ساتھ مسز ملہوترا کا خیال کیوں جڑا ہوا ہے؟ مسز ملہوترا سے آج کل ملاقات کم ہو رہی ہے لیکن پھر بھی ہو ہی جاتی ہے۔ بہت پیاری ہنسی کی مالک مسز ملہوترا تیس پینتیس سال کے درمیان ایک دل کش خاتون ہیں۔ اُن کی ہنسی بہت دلفریب ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ جذبوں کا اظہار آنسوؤں کے ذریعہ ہو سکتا ہے لیکن میں جانتا ہوں کہ آنسوؤں کے علاوہ ہنسی بھی رنگارنگ جذبوں کی غماز ہوتی ہے۔ کبھی اس میں سپردگی ہوتی ہے تو کبھی بے باک دعوت، کبھی پرجوش کی عکاسی ہے تو کبھی درد کی۔ کبھی کبھی ہنسی صرف ایک پردہ ہوتی ہے۔ ہماری سماجی زندگی پر پڑا ہوا پردہ۔ جو کئی تلخ حقائق کو ڈھک لیتا ہے۔ مسز ملہوترا کی ہنسی بھی پردہ تھی اور اُن کی مُسکراہٹ بیساکھی کا کام کرتی تھی۔ جب کبھی گفتگو کی گاڑی لڑکھڑا جاتی تو مونا لیزا کی مسکراہٹ فوراً سامنے آجاتی۔ اُن کی لڑکی آروما بار بار پوچھا کرتی تھی:

"ماسٹر جی "آگزیلیری ورب" کیا ہوتا ہے؟" لاکھ سمجھایا لیکن اُس کی سمجھ میں نہ آیا۔ شاید میں ٹھیک سمجھا نہیں سکا۔ میں جانتا تھا کہ اس سے فعل کا ماضی اور مستقبل ظاہر ہوتا ہے۔

لیکن شاید میں نہیں جانتا تھا کہ کبھی کبھی یہ پورا فعل بھی بن جاتا ہے، اگرچہ بہت کم عرصہ کے لیے۔ آروما

کو پڑھاتے وقت میں مسز ملہوترا کو ہمیشہ آس پاس دیکھتا۔ انھیں اپنی نوجوانی کی چوکھٹ سے ایک قدم پیچھے کھڑی بارہ سال کی لڑکی کا تو خیال نہیں تھا۔ شاید اُن کے اندر اُٹھتے ہوئے طوفان کی ترنگیں تھیں، جو انھیں چنچل بنا دیتی تھیں۔ ماں، بیٹی یعنی اروما اور جیسمین ایک دوسرے کے لیے کافی تھیں۔ اُن کی دُنیا دونوں تک ہی محدود تھی۔ مسٹر ملہوترا تو صرف مہمان بن کر آتے تھے۔ وہ بھی بِن بُلایا مہمان بن کر۔ اچھے خاصے خوبصورت آدمی تھے۔ جب کبھی وہ آتے تو میں اُن کی فلک شگاف آواز سنتا "ڈارلنگ!" کار سے اُترتے ہی وہ شاید بیوی کو دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن مجھے پتہ نہیں کیوں کچھ ایسا احساس ہوتا۔ "ڈارلنگ"۔ شاید کسی پالتو بلّی کا نام ہے۔ جو آواز سنتے ہی دُم ہلاتی ہوئی آجائے گی۔ مگر تازہ شگفتہ مسز ملہوترا بلّی تو نہ تھیں۔ پھر بھی سنتے ہی وہ سامنے آجاتیں۔

اروما کی ٹیوشن کرنے میں مجھے کسی مالی منفعت کا خیال نہ تھا۔ کیونکہ سو(۱۰۰) روپیہ کی میری نظر میں زیادہ اہمیت نہ تھی۔ میں اُن کا قریب ترین پڑوسی تھا اور اروما ہمارے گھر ویسے بھی آتی جاتی رہتی تھی۔ میری ٹیوشن کی وجہ تھی۔ میری تنہائی اور اُداسی، "کیا" جی ہاں ایک بنگالی لڑکی جو مجھ یوپی کے باشندے کی گرل فرینڈ اور منگیتر تھی۔ یہ بنگالی نام بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ "کیا" کی طرف مجھے اُس کے نام ہی نے متوجہ کیا تھا۔

"کیا" کا ترجمہ ہے کیوڑہ" یہ کیوڑے ہی کی خوشبو تھی جس نے مجھ جیسے ساگ سبزی کھانے والے کے لیے مچھلی کی بُو کو قابلِ برداشت بنا دیا تھا۔ مختصر یہ کہ "کیا" پر شادی سے پہلے پڑھائی پُوری کرنے کی دُھن سوار تھی اور میں نے عاشقِ صادق کی طرح سب مان لیا تھا۔ میں والدین، بھائیوں اور دوستوں کے باوجود تنہائی محسوس کر رہا تھا۔ "کیا" کے خطوط اس تنہائی کو مزید اُداسی میں بدل دیتے تھے۔ انھیں دنوں میں اروما اور مسز ملہوترا کے قریب آیا۔ وقت گزاری کے لیے میں نے اروما کو پڑھانا منظور کر لیا۔ پھر اس کنبہ سے میرا لگاؤ بڑھتا ہی گیا۔ ایک بار مسز ملہوترا کو عجیب سے موڈ میں دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ وہ گلابی گلابی جاڑوں کی ایک فرحت انگیز صبح تھی۔ پانچ بج رہے تھے۔ تارے ڈوب چلے تھے۔ میں عادتاً سحر خیز ہوں۔ اس روز اور بھی جلدی اُٹھ گیا تھا۔ سفید اور پیلے گلاب کے پودے کو دیکھ کر سرشار تھا۔ یہ ملی جلی قلم میں نے خود ہی تیار کی تھی۔ اچانک مسز ملہوترا کے پھاٹک پر ہارن زور زور سے بجنے لگا۔ اور "ڈارلنگ!" کی صدائیں اُبھرنے لگیں۔ کار میں مسٹر ملہوترا ہی تھے۔ پتہ نہیں کیوں وہ پھاٹک کھول نہیں رہے تھے۔ میں عجیب شش و پنج میں تھا۔ میں نے اندر سے مسز ملہوترا کو آتے دیکھا۔ یہ کیا! سوجی آنکھیں، بکھرے بالوں اور میلگجے رات کے لباس میں پالتو بلّی کہیں کھو گئی تھی۔ البتہ

ایک زخمی چڑیا ضرور پھڑپھڑا رہی تھی۔ وہ ابھی کار تک پہنچی بھی نہ تھیں کہ اسٹیرنگ چھوڑ کر ملہوترا صاحب خرّاٹے لینے لگے۔ وہ کار کا دروازہ کھول کر انھیں اُتارنے لگیں۔ لیکن اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ مسٹر ملہوترا قوی ہیکل تھے۔ اب مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں باہر نکلا اور سیدھا اُن کے گھر کی طرف چل پڑا۔ مسز ملہوترا ایک لفظ بھی کہے بغیر میری مدد سے مسٹر ملہوترا کو اندر لے گئیں۔ اُن کو آرام سے بستر پر لٹا کر میں واپس آ گیا۔ اُس دن مجھے پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ مسٹر ملہوترا عادی شرابی تھے۔ بعد میں یہ نظارہ کئی بار دیکھنے کا موقع ملا کہ مسز ملہوترا اُن کو کار سے اُتروا رہی ہیں اور وہ اُن کی کمر میں ہاتھ ڈالے اول فول بکتے ہوئے چلے آ رہے ہیں۔ ڈوبتے چاند کی بیمار روشنی میں یہ منظر بڑا اندوہ ناک لگتا ہے لیکن ہر صبح مسز ملہوترا پھر اُسی طرح تر و تازہ نظر آتیں۔ دن گزرتے گئے۔ اروما ساتویں جماعت کا امتحان دے کر فارغ ہو چکی تو میں نے کچھ عرصہ کے لیے اُن کے گھر جانا بند کر دیا۔ ایک دن وہ آئی اور کہنے لگی "ماسٹر جی! ممّی بُلا رہی ہیں"۔ میں باہر پہنچا تو دیکھا کہ وہ اودی ساڑی اور جامنی لپ اسٹک سے سجی تیار کھڑی ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بولیں "ماسٹر جی! اگر آپ مصروف نہ ہوں تو میرے ساتھ بازار چلیے۔ مجھے کچھ کام ہے"۔ مجھے ذرا تعجب تو ہوا، مگر میں جھٹ پٹ تیار ہو گیا۔ باہر پہنچا تو دونوں ماں بیٹی کار لیے میری منتظر تھیں۔ ہم تینوں اگلی سیٹ پر بیٹھے۔ بازار پہنچ کر انھوں نے کئی چھوٹی موٹی چیزیں لیں۔ اروما کے لیے کپڑا خریدا۔ بعد میں ہم سب ایک ریسٹورانٹ میں آئس کریم کھانے کے لیے پہنچ گئے۔ جب ہم بیٹھ گئے تو وہ بولیں۔ "ماسٹر جی! میرے قُرب کی وجہ سے آپ نروس ہو رہے ہیں نا؟" "آپ کو شاید کچھ عجیب سا لگ رہا ہوگا۔" مجھے کچھ بھی نہیں لگ رہا تھا مگر یہ بات سنتے ہی میرے وجود میں پھریری سی دوڑ گئی۔ "آپ کی ہاتھ کی بناوٹ بڑی انوکھی سی ہے" انھوں نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اُن کا انداز بازاری نہ تھا، ہاں اس میں بچکانہ بے تکلفی ضرور تھی تاہم میں سراپا پسینے میں ڈوب گیا۔ اروما ہر طرف سے بے خبر آئس کریم کھانے میں مصروف تھی۔ اس طرح وہ تجربہ ختم ہوا۔ ایک دن وہی حادثہ دہرایا گیا۔ رات کا پچھلا پہر دو بجے کا وقت تھا۔ اچانک میری آنکھ کھُل گئی۔ مسٹر ملہوترا پھر دیر میں آئے تھے۔ جسمین اُسے سہارا دیئے اندر لے جا رہی تھی۔ چاند ہلکے بادلوں کی اوٹ میں تھا۔ نرم دھندلی چاندنی میں اُن کا وجود ایسا خواب آگیں معلوم ہو رہا تھا کہ میں اپنی کھڑکی سے انھیں تکتا رہا۔ فضا میں تازہ کھلے گلابوں کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ چاند کی مٹی مٹی سی روشنی میں لمبے دامنوں والا شب خوابی لبادہ پہنے وہ نہ جانے کیا لگ رہی تھی۔ مظلوم صابرہ اور سہارے کی محتاج اچانک میرے سامنے "دکیا" کا چہرہ آ گیا۔ کتنی خود پسند اور خود غرض عورت ہے۔ اُس کی زندگی کا مقصد

ہے ایک اونچا عہدہ اور عالیشان کرسی۔ کہاں وہ اور کہاں یہ۔ دونوں میں کوئی مماثلت ہی نہیں۔ اور جسمین بھی تو مجھے پسند کرتی ہیں۔ اوہ، میں تو دیوانہ ہو رہا ہوں۔ عمر میں بڑی ہوں گی، مگر ہیں کتنی دل پذیر۔ یاسمین کی خوشبو مجسم ہوگئی ہے۔ اس دن کے بعد میں نے اپنے سرکش دل کو بے لگام چھوڑ دیا۔ ہم دیوانہ وار تیزی سے ایک دوسرے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

۔ یا شاید صرف میں بڑھ رہا تھا۔ جسمین کی آنکھوں میں خاموش پیغام تھا تو ضرور لیکن اس پر چلمن پڑی رہتی تھی۔ اب خاموش سمجھوتہ ہوگیا تھا کہ ہر بار پہلی آہٹ پر ہی اٹھ جاتا۔ ملہوترا صاحب کو سہارا دیتا اور جسمین کے قرب سے سرشار رہتا۔ "کیا" کے خط آتے رہتے لیکن میں رسمی سے جواب دیتا۔ "کیا" کی محبت میں ایک معاہدہ تھا اور جسمین کا انداز ممتا بھری گھلاوٹ لیے ہوئے تھا۔ میں اُن کی ہی محبت میں ڈوب رہا تھا۔ کون کہتا ہے کہ پہلی محبت میں جنون کی آمیزش ہوتی ہے۔ میری تو دوسری محبت ایک آتش سیال کی طرح میری رگ رگ میں دوڑ رہی تھی۔ میں کوئی ٹین ایجر نہ تھا۔ اٹھائیس سال کا برسرِ روزگار نوجوان تھا لیکن میری محبت بیکراں تھی۔ جب اس کے اظہار کی اور کوئی صورت نہ ملتی تو اروما کا لاڈ کرنے لگتا۔ اب گرامر اور آکزیلری ورب اُس کی سمجھ میں آنے لگا تھا۔

ایک رات تین بجے کے قریب مسٹر ملہوترا لڑکھڑاتے ہوئے اپنے دروازے پر آئے۔ اُس وقت اُن کی حالت کچھ بہتر تھی۔ انھوں نے خود ہی پھاٹک کھول لیا اور کار وہیں چھوڑ کر اندر آگئے۔ میں اُٹھ تو گیا تھا لیکن باہر ہی ٹھہرا رہا۔ اتنے میں جسمین باہر آئیں اور اُن کو سہارا دینے لگیں۔ انھوں نے جیسے ہی اپنے شوہر کا بوجھ سنبھالنا چاہا۔ مسٹر ملہوترا نے ایک شرمناک گالی کے ساتھ اُن کے ایک تھپڑ مارا۔ مسز ملہوترا جیسے بجلی کے کرنٹ سے بے حس و حرکت ہو کر وہیں کھڑی رہ گئیں اور وہ اندر چلے گئے۔ اور میں جواب تک پھاٹک کے باہر کھڑا تھا خدا جانے کیوں جسمین کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے آہستہ سے اُن کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ سوکھی سوکھی سی ہچکیاں۔ لیتی ہوئی مجھ سے لپٹ گئیں ۔۔ "رتیش، رتیش! وہ نہ جانے رُندھی ہوئی آواز میں کیا کہنا چاہتی تھیں۔ میرے دل میں اُن کے لمس سے کوئی طوفان نہیں جاگا۔

میں اُن کی مصیبت کا شریک بن کر اُن کو تھپتھپاتا رہا۔ ایک آہ کے ساتھ انھوں نے کہا۔ مجھے بچالو۔ "رتیش! مجھے یہاں سے لے چلو کہیں بھی!" اس آزمائشی گھڑی میں بھی میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ انھوں نے پہلی بار مجھے نام سے پکارا ہے۔ میری خاموش پوجا بے اثر نہیں گئی تھی۔ "میں تمہارے ساتھ ہوں، جسمین سنبھلو!"

میں نے کسی نہ کسی طرح یہ الفاظ ادا کیے۔ میرے بازوؤں میں جھولتی ہوئی پھولوں کی ڈالی نے آنکھیں کھول دیں۔ یہ پالتو بلی یا زخمی چڑیا کی آنکھیں نہ تھیں۔ یہ تو غضیل شیرنی کی نگاہ تھی۔ بھوری آنکھوں میں سبز رنگ تو جگمگا رہا تھا۔ میں اُن کی باغی آنکھوں میں ڈوب گیا۔ پھر وہ اندر چلی گئیں اور میں کچھ دیر تک وہیں کھڑا رہا۔

جب میں واپس آکر دراز ہوا تو میرے سارے گھر میں سناٹا ہی سناٹا تھا۔ اُس رات کو کیا ہوا یہ کسی کو بھی پتہ نہیں چلا۔ اگلے دن میں حسب معمول آرونا کو پڑھانے کے لیے اُن کے گھر گیا۔ میں ارونا کو آخری بار سمجھانے کی کوشش کرنے لگا کہ "آکزیلری ورب" کبھی کبھی مکمل فعل کا بھی کام کرتا ہے مگر کوئی طویل عبارت اس طرح نہیں لکھی جا سکتی۔ اس کو سمجھاتے سمجھاتے شاید میں ہی بھول گیا۔ اتنے میں اندر سے پھول کی طرح کھلی سجی سنوری جبین باہر نکلیں اور بہت رس بھرے لہجے میں مجھ سے بولیں "چائے پی کر جائیے گا"۔۔۔ رئیس بھیا! مجھے بچھو کا ڈنگ لگا اور میں نہ جانے کیوں چپ ہی رہا۔ مجھے جمنا پر تعمیر ہونے والے باندھ کا خیال آگیا۔ طوفان اور سیلاب جتنا تیز رفتار ہوتا ہے اتنا ہی مضبوط باندھ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کبھی سیلاب غالب آجاتا ہے کبھی انسان کی پیش بندیاں۔ میں خالی الذہن سا ہو گیا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ "کیا" کے خط کا جواب میں نے بہت دن سے نہیں دیا ہے۔

# علاج

سُرنگی مائل شام کب رات میں ڈھل گئی، مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ آج کا دن بھی عجیب تھا۔ زخم سے
مواد بہہ جانے ملون بھی ہے اور نشتر کے شگاف کی بے چینی بھی۔ بہرحال جو کچھ بھی ہوا، اچھا ہی ہوا۔ آج کل میں
انگلش کی کلاسکل کتابیں پڑھتا رہتا ہوں۔ اسی میں میں نے ایک لفظ پڑھا تھا "ایمپیتھی"
اس کا مفہوم ہے کسی ذات میں خود کو شامل کر کے اس کے احساسات کو سمجھنا۔ میرے کرب اور اذیت سے بھرے
ہوئے تین سالوں کو سمجھنے کے لیے بھی کسی کو میرے ساتھ "ایمپیتھی" قائم کر لینا چاہیے۔ ہر
شخص سوچتا ہے کہ اتنی خوبصورت پڑھی لکھی اور سلیقہ مند بیوی کے ہوتے ہوئے مجھے کیا دکھ ہے؟ ایک عجیب
سی بات ہے کہ میری خواہشوں کا پورا ہونا ہی میرے لیے ایک بددعا بن گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں نے
اپنے دل کی آواز سننے میں ہی غلطی کی ہو۔

میری نازک اندام اور ذہین بیوی "مونی" کے میکے والے اعلیٰ سرکاری عہدوں پر فائز لوگ ہیں۔ بہت
پڑھے لکھے اور امیر متوسط طبقہ کے علمبردار لیکن میرے والد ایک نیم خواندہ زمیندار ہیں۔ سارے بھائی تجارت
اور کھیتی باڑی میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن اُن سب کے برعکس میں نے ریاضی میں ایم۔ ایس۔ سی۔ کر کے
آئی۔ اے۔ ایس کر لیا۔ اس طرح میں عارضی لیکچرار شپ چھوڑ کر مستقل طور پر گورنمنٹ مشینری کا ایک پُرزہ
بن گیا۔ میرا تقرر ہوتے ہی رشتے برسنے لگے لیکن میں اپنے بھائیوں جیسی بیوی نہیں چاہتا تھا۔ تحمل تحمل کرتی

سیٹھانیاں آدھ کلو سونے سے بدشکلی اور وزن میں اضافہ کرتی ہوئی بدوضع ہستیاں میرے لیے قطعاً بے کشش تھیں۔ میں پڑھی لکھی برسرِ روزگار سوشل خوبصورت لڑکی کی تلاش میں تھا۔ "موتی" کی شکل میں وہ بھی مل گئی۔ ماں نے اُسے پہلی ہی نظر میں ناپسند کر دیا لیکن شادی میری ہونی تھی سو ہو گئی۔

عام جوڑوں کے برعکس یہ بیوی کی بَک بَک کرنے کی عادت فضول خرچی یا بناؤ سنگار نہ تھا جو میرے لیے مصیبت بنتا بلکہ اُس کی دانشمندانہ خاموشی اور دلفریب سادگی تھی جو مجھے تڑپا گئی۔ وہ ویسی عام عورت نہ تھی جسے کبھی پھٹکار اور کبھی پچکارا جا سکے بلکہ وہ ایک مستقل مزاج عورت تھی۔ جس کی رائے ہر چیز کے لیے بنی تُلی ہوتی تھی۔ یونیورسٹی میں پڑھاتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ انگلش لٹریچر کی ماہر تھی۔ آکسفورڈ لہجے میں بولی جانے والی انگلش اور بہترین طور طریقے اُس کی شخصیت کو نکھار دیتے لیکن میں اُس کے سامنے بالکل بونا سا ہو گیا تھا۔ وہ گگول اور کافکا کا مطالعہ کرتی اور میں بسٹ سیلرز پڑھتا تھا۔ ہمارے گھر آنے والا ہر انسان اس سے متاثر ہوتا تھا۔ اس دن کی ہی تو بات تھی جب ندا ہمارے گھر آیا۔ ندا میرا دوست اور ساتھی ہے۔ قابل اور گمبھیر شخصیت کا مالک ہے۔ بات چھڑ گئی آج کل کی فیشن پرستی اور خود نمائی میں ڈوبی ہوئی عورتوں پر۔ ندا کا کہنا تھا کہ یہ فیشن پرستی فحاشی تک لے جائے گی۔ ہمارا سماج غرق ہو جائے گا۔ ہماری سب پُرانی قدریں فنا ہو جائیں گی۔ اس بے حیائی نے جسمانی تعلقات کو بہت سطحی اور بے ہودہ بنا دیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

کچھ دیر بعد موتی نے اظہارِ خیال کیا۔ اس خیال کی کوئی بنیاد نہیں کہ آج کل بے حیائی اور فحاشی اس قدر بڑھ چکی ہے جتنی پہلے کبھی نہ تھی۔ مختلف کوک شاستر بہت پُرانے زمانے میں لکھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ اِس زمانے کی مورتیوں، تصویروں، ڈراموں اور دوسری چیزوں کو دیکھ کر بھی سمجھ میں آجاتا ہے کہ سیکس اس زمانے میں انسان کے دماغ پر سوار تھی۔ طوائفوں کے علاوہ بھی تمام عورتوں کو بھی مردوں کو قابو میں رکھنے کے گُر بطورِ فن سمجھائے جاتے تھے۔ اس معاملے میں وہ لوگ ہم سے کہیں آگے تھے۔ معمولی سی بحث کے بعد ندا خاموش ہو گیا۔ موتی نے یہ محسوس کرتے ہی موضوع بدل دیا۔ "ندا! ہم انجینروں کی محفل میں دانشور سمجھا جاتا ہے۔ میری بیوی کے سامنے وہ بھی دب گیا جس بات پر مجھے فخر محسوس کرنا چاہیئے تھا۔ اس پر میں کسک محسوس کر رہا تھا اس سے بھی بُری بات تو یہ ہے کہ موتی کے سامنے میری شخصیت ننگی ہو جاتی ہے۔ میرے دل کی یہ کشمکش وہ بھانپ لیتی ہے۔

ندا کے جاتے ہی میں نے تلخی کا اظہار کیا۔ عجیب ہو تم بھی ندا۔ جیسے معمولی جان پہچان والے کے

سامنے سیکس پر بے تکان بولے جا رہی تھیں۔ وہ پتہ نہیں کیا سوچتا ہوگا۔

"تم مجھ پر نہیں اپنے پر غصہ کر رہے ہو یوگی"۔ اُس نے مختصراً یہ ہی جواب دیا۔ "یوگی" یوگیندر کا مخفف جب میں مونی کی زبان سے سُنتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ سچ مُچ جوگی بن کر گھر بار تیاگ دوں۔ کسی سدھارتھ کی طرح میں ایک گھنگھور اندھیری رات کو دبے قدموں سے اپنی سوتی ہوئی اردھانگنی کو چھوڑ جاؤں۔ شاید مہاتما بدھ نے بیراگ لینے کا تہیہ ایسے ہی کسی تناؤ کے لمحے میں کیا ہوگا۔ تلاشِ حق تو ایک بہانہ تھی۔ ایک دن ضرور میں گھربار چھوڑ دوں گا۔ یہاں میری حیثیت ثانوی ہو گئی ہے۔ یہ گھر میرا نہیں، یہ عورت بھی میری نہیں ہے۔ یہ زندگی جو میں جی رہا ہوں، میری نہیں ہے۔ شادی سے پہلے میں بچوں کا بالکل خواہش مند نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ ماں بننا عورت کی سب سے بڑی خواہش ہے۔ اسی خواہش کی تکمیل کیلیے میری بیوی دل ہی دل میں تڑپ جائے گی۔ میں چاہتا تو نہیں تھا مگر صرف اسی کی خواہش کو پورا کروں گا۔ ہمارے ایک ہی بچہ ہوگا لڑکا یا لڑکی۔ اگر بیوی اور بچوں کی تمنا کرے گی تو میں ہرگز حامی نہ بھروں گا۔ حقیقت کچھ عجیب سی نکلی، مونی نے جب جب مستقبل کے خاکے بنائے اُس میں بچوں کا کہیں نام ہی نہیں آیا۔ ایک بار اُس نے کہا تھا کہ "تخلیق" بیشک ایک مسرت ہے، خواہ ایک کتاب ہو، تصویر ہو یا انسان کی، کچھ عجیب سی گھٹن محسوس ہوئی ـــ ان سب خواہشوں کی تکمیل جو میں خود کوشش کرکے پوری کرنا چاہتا تھا وہ خود بخود پوری ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ دانشوری کے اس غلاف کے نیچے اس کی نسوانیت ہمیشہ کے لیے چھپ گئی۔ کہر میں لپٹی ہوئی یہ حنوط شدہ لاش میرے نصیب میں کیوں آئی۔ میں اپنا تجزیہ کرتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ میں فلاں فلاں خوبی اپنی ہونے والی بیوی میں چاہتا تھا۔ لیکن میرا یہ خیال دراصل خود فریبی تھا۔ میں ہی سیدھی سادھی اطاعت شعار اور گھریلو بیوی چاہتا تھا۔ جیسی زیادہ تر لوگ چاہتے ہیں۔ مجھے اپنے سے زیادہ خود اعتماد اور مکمل ہستی کی تلاش نہیں تھی۔ بلکہ میں چاہتا تھا کہ لوگ مجھے انفرادی طور پر فیصلے کرنے والا آزاد خیال انسان سمجھ لیں۔ بیوی کے سلسلے میں میرے سارے معیار وبالِ جان بن گئے ہیں۔

اگر کوئی ایک بات بھی ایسی ہوتی کہ خود کو میں اس سے برتر محسوس کر سکتا تو شاید یہ تناؤ اور گھٹن یوں مجھے توڑ کر نہ رکھ دیتے۔ خاندان اس کا مجھ سے بہتر ہے۔ تنخواہ اس کی اور میری برابر ہے۔ وہ نفسیات پر برابر مقالہ لکھتی رہتی ہے۔ اگر مجھے نفسیات سے شُد بُد ہوتی تو ضرور ہی میں اس پر نکتہ چینی کر سکتا لیکن میں نفسیات سے بالکل نابلد ہوں۔ میں بھی بُرا نہیں لیکن وہ مجھ سے بھی زیادہ خوبصورت اور پُراثر شخصیت کی مالک ہے۔ میں جانتا ہوں میرے کئی دوست اور رشتہ دار اس ہی سے ملنے آتے ہیں۔ وہ اس قدر رکھ رکھاؤ اور مناسب فاصلہ رکھنے

کی قائل ہے کہ اس سلسلہ میں کچھ بولنا اپنے اوچھے پن کو ظاہر کرنا ہے۔ میں موٹی کو ہمیشہ کے لیے ناراض کرنا یا کھونا نہیں چاہتا، صرف اس کو گڑگڑاتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔ اپنے قدموں پر پڑے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں جو عورت کی اصل جگہ ہے۔ جی ہاں ہر عورت کی خواہ وہ موٹی ہی کیوں نہ ہو۔

بہت دنوں بعد آج شام وہ واقعہ ہو ہی گیا جس کی بنیاد بہت عرصہ سے پڑ چکی تھی۔ موٹی تلخ کلامی کبھی نہیں کرتی۔ وہ کبھی کبھی بڑے سنجیدہ انداز میں دوٹوک باتیں کرتی ہے۔ آج شام بھی چائے پیتے ہوئے وہ کچھ باتیں کرنا چاہ رہی تھی۔ باتوں ہی باتوں میں اس نے کہا "تم ہمیشہ کہیں سوچ میں پڑے رہتے ہو اور کسی دوبدھا میں جکڑے رہتے ہو۔ مجھ سے اپنے دل کی بات کیوں نہیں کہتے۔ تم مجھ سے خوش نہیں ہو۔ تم اگر اپنی ایگو (Ego) کو جھٹک دو تو ساری پرابلم (Problem) ختم ہو جائیں گی"۔ میں نے اس خوفناک عورت کی طرف دیکھا جس کا منہ نہ تھا۔ آتش فشاں کا دہانہ تھا۔ کھولتا ہوا لاوا میرے وجود کو جلا کر راکھ کر گیا۔

"کمینی، کتیا! تو اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے؟ میری انالیسس کرنا چاہتی ہے۔ تیرا منہ بند کرنا میں اچھی طرح جانتی ہوں"۔ اچانک میرا ہاتھ اس کے گالوں کو سرخ اور نیلا کر گیا۔ بے پناہ حیرت سے وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کے بعد شدید خوف ابھر آیا۔ وہ تیزی سے کمرے کے باہر چلی گئی۔ میرا دماغ بالکل پُرسکون ہو چکا تھا۔ جی ہاں! میں اس سے بلند ہوں۔ اونچا بہت اونچا...... نہ وہ میرے جواب میں تھپڑ مار سکتی ہے۔ نہ گالی کے جواب میں گالی دے سکتی ہے۔

کروٹ بدل کر جوں ہی میں لیٹا۔ میری نگاہ کیلنڈر پر پڑ گئی۔ وہ ہماری شادی کی تیسری سال گرہ کی تاریخ تھی۔ مجھے حقیقت کا علم ہو ہی گیا، اگرچہ دیر میں ہوا۔ ٭ ٭ ٭

# سایوں کی آواز

آج پھر وہ دونوں حریف آمنے سامنے تھے۔ ویسے وہ کوئی دشمن نہیں تھے بلکہ اگر دوست نہیں تو ۔۔۔ ملاقاتی ضرور تھے۔ لیکن دونوں اچھی طرح جانتے تھے کہ اُن کے درمیان ایک دراڑ ہے، اور وہ تھی ان میں سے ایک کی بیوی اور دوسرے کی محبوبہ اس صورت حال کی ذمہ دار وہ ہی عورت تھی جو اس وقت مر چکی تھی اور اس کا شوہر رنج وغم سے نڈھال تھا اور خاموش عاشق غم اور غصہ میں کھو کر پُرسہ دینے آیا تھا۔ وہ عورت دراصل ایک ٹریجدی کا شکار تھی۔ یعنی ویسے تو وہ ہر طرح سے نارمل عورت تھی۔ قبول صورت، سگھڑ اور گھریلو لیکن ساتھ ہی وہ بے چاری ایک بلند پایہ شاعرہ بھی تھی اور اس ناطے اس کی جان پہچان ایک دوسرے شاعر سے ہوئی جو بعد میں اس کا خاموش عاشق بن گیا۔ اس عورت کی شادی دوسرے مرد سے ہوئی تھی، جسے وہ پسند کرتی تھی اور وہ ہر طرح سے شاعر سے بہتر بھی تھا۔ لیکن شاعری سے اس کے شوہر کو دور کا بھی رابطہ نہ تھا ۔۔۔ دونوں حریفوں کو ایک دوسرے کے لیے الفاظ ڈھونڈنے میں ہمیشہ مشکل پیش آتی۔ اس لیے عاشق نامراد اپنے ساتھ ایک سایہ لے کر آیا تھا۔ ویسے وہ اس کے پیچھے چھپ کر چل رہا تھا لیکن اُس کا خاصا کمال یہی تھا کہ جہاں بات چیت میں لنگراہٹ آجائے وہ بیساکھی کی طرح سامنے آجائے۔ عاشق نے بڑے تعجب سے غور کیا کہ اس کے حریف نے بھی اپنے مونڈھے کے نیچے ایک سایہ چھپا رکھا ہے۔ اب ایک عجیب کیفیت تھی کہ دونوں حریف آپس میں رسمی گفتگو کر رہے تھے۔

اور وہ دونوں سائے جو اپنے آقاؤں کے اس حد تک ہم شکل تھے کہ اُن کا چربہ معلوم ہوتے تھے۔ آپس میں غیر رسمی باتیں کر رہے تھے۔ اُن کی بات چیت میں جو گونج تھی وہ کانوں کی محتاج نہ تھی بلکہ سیدھی دماغ میں جا کر لگتی تھی۔ عاشق کا سایہ کہنے لگا "تمہارے آقا نے میرے آقا کی محبوبہ کو ایک گھریلو عورت بنا دیا۔ اس کی صلاحیتیں گھٹ کر رہ گئیں۔ تمہارا آقا فنونِ لطیفہ سے قطعاً شغف نہیں رکھتا۔ وہ کیسے اپنی شاعرہ بیوی کے قابل ہو سکتا تھا۔

شوہر کے سایہ نے کہا۔" شاید وہ شاعرہ ہو گی لیکن اُس کے اندر جو عورت تھی وہ میرے آقا سے بہت مطمئن اور خوش تھی۔ اگر خدا نخواستہ تمہارے شاعر آقا کے ساتھ وہ بندھ جاتی تو اس غیر ذمہ دار آدمی کے ساتھ وہ خون کے آنسو بہا بہا کر مر جاتی۔

جواب ملا۔ "مر تو وہ اب بھی گئی۔ تمہارے آقا نے اُس کو ساس نندوں کی خاطر مدارات اور امور خانہ داری انجام دینے کی مشین سمجھ لیا تھا۔ میرے آقا نے کم سے کم اُسے اُس کے قابل رُتبہ تو دیا ہوتا دونوں کاندھے سے کاندھا ملا کر چلتے تو ادب میں شاید انمول تخلیقات چھوڑ جاتے۔ تمہارا آقا اُسے گھُن کی طرح چاٹ گیا اور اُسے محض ایک عورت سمجھتا رہا جو مرد کی خدمت کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ "یہ بے حد غلط ہے، اُسے یہاں کوئی تکلیف نہ تھی"۔ شوہر کا سایہ بولا۔" اُسے گھر گرہستی، عزت، تحفظ سب کچھ ملا تھا کوئی عورت اور چاہ بھی کیا سکتی ہے۔"

"عورت نہ چاہے لیکن ایک شاعرہ اپنا جیون ساتھی اپنے جیسا انٹلکچو ل چاہتی ہے۔ ایک عام آٹے دال کا بھاؤ جاننے والا آدمی ایک عام عورت کا آئیڈیل ہو سکتا ہے، اس جیسی باکمال شاعرہ کا نہیں۔"

شوہر کا سایہ بے حد دق ہو کر بولا تم کیا شاعرہ شاعرہ کہے جا رہے ہو۔ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ "باکمال شاعرہ" اگر "عورت نہ ہوتی تو تمہارا آقا قطعاً نوٹس نہ لیتا۔ عاشق کے سایہ پر اچانک ایک حقیقت کا انکشاف ہوا اور وہ بالکل خاموش ہو گیا۔ اپنے سایوں کی گفتگو سے اُلجھان دونوں حریف کہہ رہے تھے:" خدا آپ کو اس صدمۂ عظیم کو برداشت کرنے کی اہلیت دے۔ مرحومہ کو

بھلانا بے حد مشکل ہے، خود مجھے ان سے بے حد عقیدت تھی : "جی ہاں یاں وہ بھی برابر آپ کا نہایت عزت اور اپنائیت سے تذکرہ کرتی رہتی تھیں۔ وہ اپنے عزیزوں اور مدّاحوں سبھی کو دکھ دے گئی ہیں۔"

---

# بھگوان کا ایک دن

آخر کار طویل عرصہ کے بعد وشنو نے پھر جنم لینے کی ٹھانی۔ رام چندر جی کے بعد کرشن جی کے روپ میں ان کا پچھلا جنم تھا۔ دار المحن سے ان کا لگاؤ کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ کشیر ساگر میں ہلکورے لیتے ہوئے شیش ناگ کے بستر پر لیٹے لیٹے لکشمی سے پاؤں دبواتے رہتے۔ لیکن دکھوں بھری دنیا کی یاد بھی تڑپاتی رہتی تھی۔ شنکھ اور چکر کی صورت میں ان کے ہاتھوں میں بھرت اور لکشمن براجمان رہتے، لکشمی خدمت کے لئے موجود رہتیں۔ ہنومان ہاتھ باندھے حکم سننے کے مشتاق رہتے لیکن ان سب کے باوجود وشنو کو مرتیو لوک یعنی فانی دنیا کی یاد آتی رہتی۔ چاند سورج اور اندھیری رات کی دنیا، رنج و راحت کی ایک دوسرے کو کاٹنے والی پگ ڈنڈیوں سے بھری ہوئی دنیا۔ گلابی صبحوں اور جادو بھری شاموں کی دنیا۔ لیکن انتظار کے سوا چارہ نہ تھا۔ کل جگ میں ان کا آخری اوتار ہونا تھا۔ صدیوں کے انتظار کے بعد وہ وقت آچکا تھا لیکن بھگوان وشنو بھی اب پرانے سیدھے سادے بھگوان نہیں تھے۔ انھوں نے پہلے سیر کر کے مناسب مقام کھوجنے کی ٹھانی۔ جہاں ان کی سب سے زیادہ ضرورت ہو وہ وہیں اوتار لینا چاہتے تھے۔ انھوں نے دنیا میں ایک دن گزار کر دیکھنا چاہا۔ ہمیشہ کی طرح وہ ہندوستان میں رہنا چاہتے تھے۔ وہ آنکھوں سے اوجھل رہنے والے بھیس میں ایک سور گیہ ومان میں بیٹھ کر ہندوستان کی راجدھانی

کے اوپری متوسط طبقے کے ایک گھر میں پہونچے، ناشتہ کا وقت تھا۔ انڈا، ڈبل روٹی اور چائے میز پر لگی تھی۔ وہ ناشتہ کی ٹیبل پر ہونے والی بات چیت پر کان لگائے ہوئے تھے۔ ادھیڑ عمر کا باپ خاموشی کے ساتھ ناشتہ کر رہا تھا۔ باتونی نوجوان بیٹی اپنی اوپر سے تنگ اور نیچے سے فراخ میکسی بار بار ٹھیک کر رہی تھی۔

آدھا سلائس کھا کر اس نے چائے کا کپ اٹھا لیا "کچھ کھاتی کیوں نہیں ہو بی ستوری والدہ فرما رہی تھیں۔" نہیں کہیں وزن نہ بڑھ جائے۔ ایک گھونٹ میں چائے ختم کر کے وہ کتابیں اٹھا کر باہر کی طرف لپکی۔ نوعمر لڑکا جس کے بالائی ہونٹوں کی سیاہی ابھر رہی تھی۔ اپنے باپ سے کہنے لگا۔ ڈیڈی پلیز۔ مجھے سائنس لینے کو نہ کہیے میں انگلش لٹریچر میں بی۔ اے کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ مجھے بھی حق استعمال کرنے کا موقع دیجئے۔ باپ نے لاتعلق لہجے میں کہا آرٹس لینے کے بعد کرو گے کیا۔ نہ نوکری ملے گی نہ کوئی کریر بنے گا۔" میرا فیوچر میرا معاملہ ہے یہ میں خود ہی طے کرنا چاہتا ہوں۔ سترہ سال کے لڑکے نے قطعی جواب دیا۔ اور کے باپ نے ناخوشگواری سے بات ختم کر دی۔ بھگوان حیران رہ گئے۔ سر سر کرتے اپنے بن باس کے چودہ برس آنکھوں کے سامنے سے گزر گئے۔ انھوں نے انسان بن کر صرف حکم برداری سیکھی تھی۔ خود مختاری نہیں۔ بھگوان کو یہ ماحول پسند نہیں آیا۔ بھگوان راجدھانی سے چل کر اپنے ومان میں چڑھ کر ہندوستان کے دوسرے بڑے شہر میں پہونچے ــــ مردوں عورتوں کے ہجوم کاروں اور بسوں نے ان کا راستہ چلنا دوبھر کر دیا۔ انھوں نے معمولی سے ایک مکان کو پسند کیا وہ اندر گئے۔ ایک کمرے کا چھوٹا سا مکان تھا۔ ایک طرف سنگھار میز تھی ایک طرف کھٹولا تھا۔ ایک سال کا ننھا سا بچہ تھا۔ نوجوان شوہر اور بیوی دونوں ٹیلیفون آپریٹر تھے۔ اس لئے وہ دوپہر کے کھانے کے وقت گھر پر موجود تھے، لباس اور بالوں سے عورت مرد کی پہچان مشکل تھی۔ چست مغربی لباس میں دونوں تیار ہو رہے تھے۔ بچے کو رونہ کریش میں چھوڑا جاتا تھا۔ تنگ مزاج بیوی بڑبڑا رہی تھی۔ شاید صبح ہی شوہر بیوی میں لڑائی ہو چکی تھی۔ مرد سرد لہجے میں کہہ رہا تھا۔

"انیتا مجھے تو بچے کے خیال نے باندھ رکھا ہے۔ ورنہ میں اس طرح تمہاری حرکتوں

برداشت نہ کرتا۔ آخر ماں کو ایک دن بھی رکھنے سے تم نے انکار کیوں کیا ۔ کیا اس گھر میں ان کا کوئی حق نہیں۔ انیتا شیرنی کی طرح گرجی۔ "کون دے گا دونوں ٹائم گرم کھانا کون سارے دن ساڑی میں گٹھری بن کر رہنا پسند کرے گا۔

سر پر پلو رکھنے اور پیروں کو ہاتھ لگانے سے میرا دم گھٹتا ہے۔ رہی حق کی بات میرا منہ نہ کھلواؤ یہ تمہارا نہیں میرا گھر ہے فرم کی طرف سے مجھے ملا ہے۔ تمہیں نہیں ـــ وہ بڑبڑاتے ہونٹوں پر لپ اسٹک لگا رہی تھی۔ گیس کا کھانا وہ نہیں کھا سکتیں، انڈا اور گوشت وہ دیکھ نہیں سکتیں، کون اپنا سر کھپائے۔ شوہر نے لنچ پیکٹ سنبھالا اور کھٹ کھٹ کر کے سیڑھیاں اتر گیا۔ انیتا بدستور بڑبڑاتی رہی۔ بھگوان نے لکشمی کے سر کو سدا جھکا ہوا اور ہاتھوں کو ہمیشہ ان کے پیر دبانے کو بے قرار پایا تھا۔ ان کا دل دکھ کے ساگر میں ڈوب گیا۔ شام ہونے میں کچھ ہی دیر باقی تھی۔ انھوں نے کہیں اور جانے کے بدلے پاس ہی کے ایک کالج میں جانے کی ٹھانی۔ خوبصورت اور فیشن ایبل لڑکیوں اور لڑکوں کے پرے کے پرے اندر جا رہے تھے۔ بھگوان نے دلچسپی سے ان کی طرف دیکھا۔ ہاتھوں میں پوسٹر اٹھائے ہوئے اور ایک ہاتھ پر ایک کپڑے کا پتلا اٹھائے ہوئے وہ باقاعدہ نعرے لگا رہے تھے۔ بھگوان ان کے ساتھ اندر چلے گئے لڑکوں نے پرنسپل کے کمرے کے سامنے جا کر نعرے لگانے شروع کئے۔ عمدہ کپڑوں میں چشمہ لگائے پرنسپل صاحب باہر نکلے۔ اچانک کہیں سے آ کر ایک سڑا ہوا ٹماٹر ان کے سینہ پر لگا۔ ان کے سوٹ اور ٹائی کو برباد کر گیا۔ پرنسپل گھبرا کر اندر چلے گئے۔ طالب علم نعرے لگا رہے تھے۔ مارو اس کمینے کو گھیراؤ کر لو۔ جانے نہ پائے ہماری مانگیں پوری ہوں ودیارتھی ایکتا زندہ باد"

بھگوان بھی کبھی طالب علم تھے۔ رام اور کرشن دونوں جنموں میں، انھوں نے گرو کل میں کئی سال گزارے تھے۔ سدا ماں کے ستو ابھی جیب میں تھے۔ اور سر پر اپنے گروؤں کے شفقت بھرے ہاتھ کا لمس موجود تھا۔ بھگوان کے دل میں مایوسی کا اندھیرا اتر آیا لیکن وہ اچانک چونک پڑے۔ پاس کھڑے ہوئے کچھ لوگ زیر لب باتیں کر رہے تھے۔

"پرنسپل کا اپنا گروپ بھی بہت مضبوط ہے۔ مشکل سے پانچ چھ لیکچرار اس کے مخالف گروپ کے

ہوں گے۔ اسٹوڈیٹس میں بھی اُس کے جاسوس موجود ہیں۔" بھگوان زمانۂ حال کے گروؤں کا کردار سمجھ کر اپنا دُکھ بھی بھول گئے۔ آہستہ سے وہ وہاں سے غائب ہو کر اپنے ومان میں چڑھ گئے۔ ایک بدمزہ دن کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ کشیر ساگر بدستور تھا۔ شیش ناگ کے پھن پر اُن کا آسن حسب معمول لگا تھا۔ ہنومان ہاتھ جوڑے بیٹھے تھے۔ لکشمی جی نے انھیں دیکھتے ہی اُن کی خاک پا سے مانگ سجائی۔ تھکے ماندے اُداس بھگوان کے بیٹھتے ہی انھوں نے اپنے ہاتھ بڑھائے تاکہ پیر دبا سکیں۔

"نہیں کملا یہ سب اب رہنے دو، بڑا بیکار سا لگتا ہے۔ آپ نیا جنم کب لیں گے۔" لکشمی نے پوچھا۔
"اب انسان کو شاید بھگوان کی ضرورت نہیں۔" بھگوان نے گہری سوچ میں ڈوب کر جواب دیا۔

# سپنوں کے راہی

اچھا تو آپ ہی سائیکیٹرک ڈپارٹمنٹ دیکھنے آئے ہیں۔ جی ہاں یہی سائیکیٹرک ڈپارٹمنٹ ہے۔ زندگی کی دوڑ میں ہار کر ہتھیار ڈالنے والوں کا ہجوم ہے۔ خود فریبی کی ٹھنڈی چھاؤں میں آرام کرنیوالے لوگ اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کے لیے مسئلہ بن جاتے ہیں۔ ڈاکٹروں کے لیے وہ کیس ہیں، انسان نہیں لیکن ہر ڈاکٹر یہ بھی جانتا ہے کہ دیوانگی اور فرزانگی کی تفریق محض بے معنی ہے۔ اس کے باوجود میں یہی کوشش کرتی رہوں کہ وہ واپس اسی جہنم زار میں آجائیں۔ اُن کے خوابوں کی یہ پر فریب دُنیا تحس نحس ہوجائے۔ پھر سے ناکامی اور غم اُن پر حملہ کرنے لگیں۔ کیا ہم ڈاکٹروں کو شاید ان سے حسد ہوتا ہے، یہ عجیب رسہ کشی ہے۔ کبھی بازی ہمارے ہاتھ رہتی ہے کبھی مریضوں کے ہاتھ۔ ہمارے لیے یہ سب روزمرّہ کی باتیں ہیں۔ یہ پندرہ سالہ لڑکی اپنے کو بھگوان کرشن کا اوتار سمجھتی ہے۔ آپ اسے اس کو مریض سمجھتے ہیں تو سمجھ لیں لیکن وہ بھگوان بن کر بہت خوش ہے۔ جس آزادی دل لگی، ٹھٹھولی اور چھیڑ چھاڑ کی اُسے تمنا تھی وہ بھگوان کرشن بن کر ہی مِل سکتی تھی۔ تقریباً سارے ذہنی عوارض میں ہیلوسینیشن اور ڈلیوزن موجود ہیں۔ وہ خیالی صورتیں دیکھتے اور خیالی آوازیں سنتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ وہم اُن کے دماغ میں جڑیں پکڑ لیتے ہیں۔ یہ اُن کی ناآسودہ خواہشوں کا عکس یا مجرمانہ ضمیر کا ردِ عمل ہوتے ہیں۔

مثلاً یہ ہیں سروپ سیٹھی۔ اُن کی یہ پانچویں وزٹ ہے۔ یہ خیالی دنیا میں خیالی پیکروں کے ساتھ رہتا

ہے۔ دس سال پہلے اس کی محبوبہ کاویری نے خودکشی کرلی تھی۔ سروپ صدمے سے بے قرار ہوگیا۔ لیکن یہ لذت آمیز غم اس نے اپنے اندر جذب کرلیا۔ کچھ عرصہ بعد ایک چنچل حسینہ سے اس نے شادی کرلی۔ خوبصورت اور سلیقہ مند سدھا تنک مزاج تھی۔ شادی کے پھیرے اس نے ملکیت کی مہر سمجھ لیے۔ مزے دار کھانوں سے اس نے شوہر کے پیٹ سے دل تک پُل بنا لینا چاہا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ کاویری کا نام لے کر اُسے چھیڑتی بھی رہی۔ یہ زہر ہلاہل زندگی کے جام میں تلچھٹ کی طرح بیٹھتا رہا۔ اور سانپ کی طرح گُنڈلی مار کر بیٹھ گیا۔ اس درمیان سروپ ایک بچی کا باپ بن گیا۔ یہ بچی نیلم بادِ بہار کا جھونکا تھی یا فرار کا ایک ذریعہ۔ دھیرے دھیرے یہی اس کی زندگی کا محور بنتی چلی گئی۔ اچانک ٹیٹنس سے اس کی موت ہوگئی۔ سات سال کی خوبصورت اور چنچل لڑکی راکھ کا ڈھیر ہوگئی۔ یہیں اس ناگ نے پھنکار کر اُسے ڈس لیا۔

سروپ نے اب ایک مدھر ملائم خیالی دنیا کو پالیا ہے۔ وہ کاویری اور نیلم کے ساتھ رہتا ہے۔ کاویری اُسے صبح کی چائے پیش کرتی ہے اور نیلم اُسے ہوم ورک کے سوالات حل کراتی ہے۔ سدھا آلو کے کٹلٹ اور قیمے کے پراٹھے کے وسیلے سے اُس کے قریب آنا چاہتی ہے لیکن بجلی کے جھٹکے بھی سروپ کو جنت سے نکال کر سدھا کے پاس نہیں لا سکتے۔ یہ دیکھیے لاج ونتی بھی آگئی ہے۔ اس کا پریشان حال شوہر بتائے گا کہ آج بھی لاج ونتی کی حالت وہی ہے۔ وہ اسی طرح یاسیت کا شکار ہے۔ پانچویں لڑکی کی پیدائش کے بعد ہندوستانی ماں کے دل کے اندر ایک ڈائن نمودار ہوئی۔ وہ نوزائیدہ لڑکی کو ختم کردینا چاہتی تھی، کیونکہ ساس کے کوسنے اور بدکلامیاں بند کرنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔

ابھی یہ خواہش جڑ پکڑ رہی تھی کہ ڈایریا سے دو ماہ کی بچی مرگئی۔ اُس کی موت کا سبب خود کو سمجھ کر اُس کے مجرم ضمیر نے اُسے یاسیت کی طرف ڈھکیل دیا۔ اب نہ اُسے کوئی نظر آتا ہے، نہ کچھ دکھتا ہے۔ خلاؤں کے ایک غیر مرئی نکتہ پر اپنی نگاہیں گاڑے رکھتی ہے۔ کاش ہم اُس کے دماغ کے اندر جھانک سکتے۔ لیجیے منجو گوئل بھی آگئی۔ سترہ سالہ ذہنی مریضہ کے متوسط طبقے کی روایتوں کے امین ماں باپ کیس کو سمجھنے میں ہماری بالکل مدد نہیں کر رہے ہیں۔ منجو کو ہم میں سے کوئی نظر نہیں آتا۔ نہ وہ کسی سے بات کرتی ہے۔ وہ جب بھی بولتی ہے تو صرف انل اور چنو سے بات کرتی ہے۔ انل اس کا عاشق، کوئی سڑک چھاپ مجنوں ہوگا اور چنو اُس بچّہ کا نام ہے جسے پیدائش کے پانچ ماہ قبل ہی مار ڈالا گیا۔ کون جانے پیدائش کے بعد کنواری ماں شاید اس کا گلا ہی گھونٹ دیتی لیکن ضائع شدہ حمل اُس کے جسم میں نہیں بلکہ روح میں سرایت کرگیا ہے۔

اس کا چینو کو تھپکنا، دودھ پلانا، توتلی زبان میں باتیں کرنا، پالنے میں سُلانا سب کچھ کتنا سہل اور فطری لگتا ہے۔
اس کی دماغ کی تخلیق غیر مرئی بچہ ہمارے لیے ایک پُراسرار شے ہے۔ مگر منجو کو صرف وہی نظر آتا ہے۔ روایتوں کے بوجھ سے نڈھال اور پڑوسیوں کے طعنوں سے سنگسار والدین اپنی دُلاری بیٹی کا دکھ ذرا بھی نہیں بانٹ سکتے۔
ان سے ملیے یہ ہیں دل افروز بیگم پینتالیس سال کی کوٹھے والی عورت طوائف زادی کی شادی پندرہ سال کی عمر میں سیف الدین سے ہو گئی۔ دل و جان سے بازی لگا کر حاصل کی گئی محبوبہ بیوی بن کر پانوں کی جوتی بن گئی۔ اس کے ہر شوق، ہر خودداری اور خواہش کو کچلا گیا۔ مبادہ وہ طوائفیت کی طرف لوٹ جائے۔ اس کو پنج وقتہ نمازی بنا کر ایک کمرے میں قید کر دیا گیا اور شوہر نے جاسوسی اور نگرانی کی خدمات اپنے سر لیں۔ لیکن دل افروز ہاتھوں بھی ایک ثرب کا پتہ تھا۔ عباس ان کا اکلوتا بچہ شوہر کے حصہ کی بھی ساری محبت نثار کر کے ایک کومل سہارے کے ذریعے شوہر کے غیض و غضب کو جھیلتی رہی بے چارگی کا احساس جس کو بیٹے نے ایک سائبان بن کر روک لیا تھا۔ بیٹے کی شادی کی رات ہی اُن پر پوری طرح ٹوٹ پڑا تھا۔ اب اُن کی دنیا اُن کے نخرے اٹھانے والے ایک خیالی شوہر تک محدود تھی۔ جس کی عادتیں عباس سے ملتی جلتی ہیں۔ اپنے شوہر کو وہ قطعی نہیں پہچانتی ہیں۔ یہ ہیں کیس جن کی فائلیں بنا کر ہم نمبروں میں تبدیل کر دیتے ہیں، ٹیلیفون میں قید کر دیتے ہیں۔ الماریوں میں رکھ کر تالا لگا دیتے ہیں۔ سال کے آخر میں اعداد و شمار بنا کر چارٹوں اور گرافون سے سجا کر ورک لوڈ ظاہر کرنے والی سالانہ رپورٹ کے ساتھ منسلک کر دیتے ہیں۔ ان کیسیز کے علاوہ اس کلینک میں کچھ اور بھی کیس ہیں۔ جن کے اعداد و شمار کبھی نہیں بنے ہیں۔ سب سے پہلے لیجیے ڈاکٹر ونود رستوگی کو۔ ماہر اور مشہور زمانہ دماغی امراض کے معالج جن کی وجہ سے ڈپارٹمنٹ کا نام مشہور ہے۔ یہ بدخوابی کے مریض ہیں —— جب امریکہ وہ آخری بار گئے تو سیتاپور قصبہ کا ونود رستگی یہ بھول ہی گیا کہ مشرق ہے اور مغرب مغرب۔ اپنی تیرہ سالہ لڑکی کو اس نے مغربی آزادی تو دے دی لیکن مغرب کے والدین کے انداز سے لاتعلق نہ ہو سکا۔ ڈرگس کا استعمال کرنیوالی پندرہ سالہ لڑکی میں وہ اپنی بیٹی کے خد و خال ڈھونڈتا ہی رہا۔ اپنی نوخیز لڑکی کو انڈر ورلڈ میں کھو کر، وہ ہندوستان واپس آگیا۔ ہر رات اُسے اپنی بیٹی کے ساتھ ہونے والے وحشیانہ سلوک کا خیال پاگل کر دیتا ہے۔ اس کی بیوی کی خاموش نگاہیں چیخ چیخ کر اُسے مجرم قرار دیتی ہیں۔ وہ نیند کی گولیاں وہسکی میں گھول کر پی جاتا ہے۔ اس کے ہاتھوں کا رعشہ اور دماغ کا طوفان بڑھتا جا رہا ہے۔ دوسری بیٹی سے کبھی وہ دیوانہ وار

پیار کرتا ہے۔ کبھی بے کراں نفرت۔ یہ وہ ہی جانتا ہے کہ وہ کیسی مریضانہ زندگی گزار رہا ہے۔ اس کی ڈاکٹری اس کے کسی کام نہ آئی۔ یہ ہیں دوسرا کیس یعنی کہ سائیکٹیرک کلینک کے دوسرے ڈاکٹر ڈاکٹر بدری ناتھ ملہوترا اپنی نوجوانی کے احساس میں غلطاں ایک انتہائی معمولی گھرانے سے تعلق رکھنے والے نیم خواندہ ماں باپ کی اولاد اور اپنے خاندان کے واحد پڑھے لکھے انسان جن کی ساری زندگی اسی کوشش میں گزر رہی ہے کہ کہیں کوئی انہیں ضلع باندہ کے دقیانوسی گانوں کی پیداوار نہ سمجھ لے۔ اپنے ماں باپ سے یہ چھوت کے روگ کی طرح بھاگتے ہیں۔ بھائی بہن جانی دشمن نظر آتے ہیں۔ کسی خاندانی ڈاکٹر لڑکی سے شادی کرنے میں کامیاب ہو گئے، لیکن بیوی کے سامنے کتنے نادم اور دبے دبے سے نظر آتے ہیں۔ اُن کی بیگم کو اپنے سسرال والوں سے ملنے کا اشتیاق ہے لیکن انھیں اس خیال سے لرزا چڑھتا ہے کہ اُن کی بیوی اس گھر کو دیکھ کر کیا کہے گی۔ جہاں جانور اور انسان ایک ہی چھت کے نیچے سوتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کا گاؤں برسات میں زیر آب ہو جاتا ہے۔ جاڑے میں ڈاکٹر صاحب بے حد مصروف ہوتے ہیں۔ گرمی میں شملہ چلے جاتے ہیں۔ جھوٹ بولتے بولتے اور دوہری زندگی جیتے جیتے وہ کیسے عجیب مقام پر جا پہنچے ہیں۔ یہ اُن کی سمجھ سے بالکل باہر ہے۔ جھوٹ کے انبار کے نیچے دب کر وہ سسک رہے ہیں۔ یہ سب ڈاکٹر ہیں یا مریض، کچھ پتہ نہیں۔ مریضوں کا علاج کس لیے کیا جا رہا ہے کہ وہ تصورات کی دنیا سے اس دنیا میں آجائیں، جس میں ڈاکٹر رہتے ہیں۔ کیا اس سفر سے کچھ حاصل ہو گا۔ یا مریض پہلے سے بھی بھیانک صورت حال میں پہنچ جائیں گے۔ ان سوالوں کے جواب میں مہینہ دو مہینہ سوالوں کا سلسلہ کھلتا جائے گا۔ یوں بھی دنیا میں سوالوں کی تعداد زیادہ ہے جوابوں کی کمی یہ ہیں ڈاکٹر سدھانشو رائے، چرب زبان، ہنس مکھ، اور شاہ خرچ اُن کی بیماری ابھی سات پردوں میں مستور ہے۔ ان کی موٹی اور بدشکل بیوی اُن کے ماں باپ کی آنکھوں کا تارہ ہے، کیونکہ گھر میں لکشمی کے انبار لے کر آئی ہے۔

سدھانشو جی ماں باپ کے فرماں بردار بیٹے اور بہنوں کے لائق فائق بھائی ہیں۔ سب کی مشکلیں مسز رائے کے آنے سے سلجھ گئیں۔ لیکن سدھانشو جی نے اپنی مرضی سے شوہر کے بدلے غلام کا درجہ لے لیا ہے۔ اس کے باوجود مسز رائے کا محبوبہ یا بیوی بننا مشکل ہے لیکن بُرا ہو شرافت کا، اپنی خواہش ایک بالواسطہ طریقے سے بھی پوری کر سکتے ہیں۔ مریضوں کی ازدواجی زندگی کی پریشانیاں عجیب وغریب جنسی حرکتیں تفصیل سے سنتے ہیں اور مصنوعی ذمہ داری سے سر ہلا کر اُن سے کہتے ہیں۔ کسی بھی کیس کو ٹریٹ کرنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ اس کی سیکس لائف کے بارے میں معلومات ہوں۔ ہر کیس ہسٹری میں انھیں بلو فلم کا مزہ آتا ہے۔ خود کو وہ

ریر محسوس کرتے ہیں۔ لیکن اُن کی ہیروئن انتی کلوورزن والی مسز رائے کبھی نہیں۔ اُن کی بھوکی نگاہیں اور ہاتھوں کی غیر شعوری جنبش ایک تشنہ کام انسان کی عکاسی کرتی ہیں۔ یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ وہ مثالی شوہر، بیٹے اور بھائی سمجھے جاتے ہیں۔ یہ ہیں میرے شوہر ڈاکٹر گوئل بائیس برس پہلے میری اُن سے شادی ہوئی تھی۔ یہ کیسی شادی تھی یہ لو میرج تھی نہ کہ ماں باپ کی، کی ہوئی شادی۔ یہ شادی ایک پردہ تھی جو میری پرانی زندگی پر ڈال دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب ایک چالیس سالہ شخص تھے۔ جنھیں پچھلی بیوی کی موت کے بعد ایک بیوی کی ضرورت تھی۔ اپنا کلینک کھولنے کے لیے انھیں ڈاکٹر بیوی کو ترجیح دینی تھی۔ قبول صورت جوان ڈاکٹر لڑکی کو دیکھ کر انھیں اس کے ماضی میں جانے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہوئی۔ میں جب انھیں ملی تو کمل امریکہ جا چکا تھا اور سانپ کا سپنولہ مجھ میں منتقل ہو چکا تھا۔ بہت جلد مجھے کمل اور اُس کی نشانی سے نجات مل گئی اور ستی ساوتری بن کر میں ڈاکٹر صاحب کے خلوت کدے میں آگئی۔

ڈاکٹر صاحب کلینک کے حساب کتاب میں لگے تھے۔ اور میں اپنی جگہ بنا رہی تھی۔ وفا اور جفا کا مفہوم فنا ہو چکا ہے۔ ہم وفادار ہیں صرف گھڑی کی سوئیوں کے۔ سوال حق بجانب ہے کہ ہم شوہر و بیوی ہیں۔ یا صرف ہم یہ سوچتے ہیں کہیں ایسا تو نہیں یہ ایک بھیانک خواب ہو۔ جب آنکھ کھلے تو میں کمل کی باہنوں میں جھولا جھول رہی ہوں ہائے کمل تم جیسے مکار و بے وفا نے اپنی امریکی بیوی کے ساتھ اُلفت کیسے نباہی جو بائیس ۲۲ برس سے نہ لوٹ سکے۔ کمل اُف کیا تمہارے خوابوں پر بھی کیا میری حکمرانی ہے؟ گھر کا ایک فرد اور بھی ہے۔ میرا بیس سال کا جوان بیٹا رشی جو کمل کا بیٹا نہیں، لیکن پھر بھی اس سے خوفناک طور پر شابہ ہے۔ میرا گناہ مجسم ہو کر میرے سامنے آتا ہے۔ اسکول کی پڑھائی اچھے نمبروں سے پاس کرنے کے بعد اب وہ آگے پڑھنا نہیں چاہتا۔ وہ دیس بدیس گھوم کر زندگی کا تجربہ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ میری سہیلی اوشا کہتی ہے کہ تیرا بیٹا ابنارمل ہے یعنی ہونی خول مجذوب۔ لیکن مجھے نہیں معلوم میں تو اتنا جانتی ہوں کہ کون نہیں ہے ابنارمل وہ لوگ جو علاج کر رہے ہیں یا وہ لوگ جن کا علاج ہو رہا ہے۔ یا پھر وہ لوگ جن کا مرض ابھی تک پہچانا نہیں جاسکا۔

٭٭٭

# برزخ

"تمہارے کرنے کے لیے اور بہت سے کام ہیں، تمہیں اس سلسلے میں کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں" یہ آواز نہیں ایک فیصلہ تھا جس کی اپیل دنیا کی کسی عدالت میں نہیں ہوتی۔

بات اتنی آسان نہیں بلکہ کچھ پیچیدہ ہے۔ اتنا ہی نہیں اُس کی شروعات بھی کافی پُرانی ہے۔ نئی ہے تو بس روشنی کے لیے اپنے جذبہ کی پہچان۔ اپنی نفرت کی دہکتی ہوئی جوالا سے وہ خود ہی جُھلس رہی ہے۔ وہ اس کی تندی سے خود ہی حیران رہ جاتی ہے، لیکن وہ حیران ہو یا پریشان۔ ان سب چیزوں سے فرق کیا پڑنے والا ہے۔ کبھی گھاٹے کا سودا ہوا تھا۔ اسی میں اس کا سب کچھ لُٹ گیا۔ اب خالی رہ گئے۔ دل کو اور مشاغل سے بہلانا ضروری ہے۔ اور مشاغل؟ یعنی یہی اپورو کی دیکھ بھال۔! کہیں سے بھی چلو بات یہیں پہنچتی ہے ـــ مرکز وہی ہوتا ہے۔ بس دائرہ کبھی بڑا ہوتا ہے کبھی چھوٹا۔ وہ بات جو پہلے ہلکا سا بے اطمینانی کا احساس تھی دھیرے دھیرے پلنے والے ناسور کی طرح بڑھنے لگی ہے۔ بات واضح تب ہوئی جب روشنی نے اپنے ڈیڈی کو بُلانا چاہا۔ بھیا، بھابی ایک سال کے اگریمنٹ پر جدہ گئے ہوئے تھے۔ ڈیڈی سے بات کرنے سے پہلے اس نے پرچل سے بات کرلینا مناسب سمجھا۔ لیکن یہ خیال ضرور آیا کہ وہ پرچل سے کیوں پوچھ رہی ہے۔ پرچل تو اپنی ماں کے آنے سے پہلے کبھی اجازت لینا تو دُور، باقاعدہ اطلاع بھی نہیں دیتا لیکن بات وہیں رہی۔ روشنی نے جھجکتے ہوتے پوچھ ہی لیا۔ پرچل نے بڑی حیرانی سے اُس کی طرف دیکھا، پھر بڑی ناگواری سے جواب دے دیا۔ "تم جانو" اتنا تحقیر آمیز

جواب تھا کہ روشنی کچھ بول نہیں پائی۔ روشنی کو دو ہزار روپیہ تنخواہ ملتی ہے لیکن گھر بار سب پر پھل کا ہے۔ چاہ کر بھی روشنی قبضہ نہیں جما سکتی۔ یوں ڈیڈی کو بُلانے کی بات ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ اگر ان کے آجانے پر پر پھل ڈیڈی کی شان میں گُستاخی کرتا تو!

روشنی کی شادی محبت کی شادی نہیں تھی۔ اگرچہ اُس کی ساری سہیلیاں مختلف قسم کی محبتوں کی تکمیل میں مصروف تھیں۔ لیکن روشنی کو پالیٹیکل سائنس میں ایم۔اے۔ اور پی۔ایچ۔ڈی۔ کرنے سے ہی فرصت نہیں ملی ـــ چھبیس ۲۶ سال کی عمر میں جب اُسے اچانک ڈیڈی کی پسند سے شادی کرنا پڑی تو وہ مطمئن سی تھی۔ لیکن دھیرے دھیرے اُسے احساس ہو گیا۔ شادی ایک طویل غلامانہ زندگی کی شروعات ہے۔ ایک بیل بھری گھٹن اُس کے رگ و ریشے میں جمتی جا رہی ہے۔ اُس کے دل و دماغ دھیرے دھیرے مفلوج ہونے لگے ہیں۔ وجہ بالکل صاف ہے۔ پر پھل کا گھٹیا پن اتنا واضح ہوتا ہے کہ وہ کوشش کر کے بھی اُس کی عزت و احترام ذرہ برابر بھی نہیں کر پا رہی ہے۔ محبت کے بغیر ازدواجی زندگی چل سکتی ہے لیکن آپسی احترام کے بغیر نہیں۔

پر پھل کو اپنے کسی کام سے دہلی جانا ہوتا ہے، اس کے پاس گاڑی نہیں ہے۔ وہ کوشش کرتا ہے کہ کسی سے لفٹ مل جائے۔ اس کے لیے وہ ہر قسم کے ہتھکنڈے اپنا سکتا ہے۔ روشنی کے ڈیڈی بہت شریف انسان ہیں۔ اُن کی نیکی اور شرافت کا وہ ہمیشہ طنزیہ انداز میں تذکرہ کرتا ہے۔ روشنی اس کی بات کا جواب دینا اوچھا پن سمجھتی ہے۔ روشنی کے ڈیڈی کے دوست کا بیٹا ہے اروند۔ وہ اور اُس کی بیوی دونوں ڈاکٹر ہیں۔ روشنی اُن دونوں سے بہت محبت کرتی ہے۔ اپنائیت سے پیش آتی ہے۔ پر پھل انھیں کوئی خاص پسند نہیں کرتا۔ وہ روشنی کے ڈیڈی کا تذکرہ بہت احترام سے کرتے ہیں۔ اور پر پھل چڑ کر کوئی طنزیہ بات کہتا ہے۔ وہ ڈیڈی سے کسی خاص بات کے سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں اور اسی لیے وہ دہلی جانا چاہتے ہیں۔ پر پھل لفٹ لے سکتا ہے لیکن عین موقع پر روشنی یہ کہہ کر پروگرام رد کر دیتی ہے کہ ڈیڈی حصار گئے ہوئے ہیں۔ پر پھل سرخ آنکھوں سے اُس کی طرف گھورتا رہ جاتا ہے۔ اُسے ملنے والی مفت کی لفٹ کھٹائی میں پڑ گئی۔ گھر واپس آنے کے بعد اس پر وہ برس پڑتا ہے۔ روشنی کو اس کے غصہ پر نہیں بلکہ اوچھے پن پر افسوس ہے۔ کچھ پیسوں کو بچانے کے لیے انسان کتنا گر سکتا ہے۔ وہ سوچتی ہی رہ جاتی ہے۔ ڈیڈی یہاں نہیں ہیں۔ وہ اروند کو کیسے بہانہ سے وہاں لے جائے کہ پر پھل اُس کی کار کا استعمال کر سکے۔ جیون نیا ایک خوفناک بے کراں سمندر میں چلی جا رہی ہے۔ بادبان تار تار ہے اور مستول سرنگوں۔ اکٹوپس کی بے شمار باہیں اُس کے تعاقب میں ہیں۔

روشنی اپنے بغل میں سوئے ہوئے عفریت کو بار بار غور سے دیکھتی ہے۔ مَن کا کوئی رشتہ نہیں لیکن تن کا رشتہ ہے، جو اُسے اپنی ہی نظروں میں طوائف بنا رہا ہے۔

اور اب پرکھل کا نیا شوق۔ وہ اوّل درجہ کا کنجوس ہے۔ ایسے شوق پر پیسہ نہیں خرچ کر سکتا لیکن اپنے آفس میں کام کرنے والی لڑکیوں کی مجبوری کا فائدہ تو اُٹھا سکتا ہے۔ آج کل ایک اٹھارہ سالہ بے حد معمولی گھر کی عیسائی لڑکی سے اُس نے پینگیں بڑھا رکھی ہیں۔ رات کو دیر سے واپس آنے کی اکثر روشنی کو باز پرس کرنی پڑ جاتی ہے۔ روشنی کو بڑا تعجب ہوتا ہے۔ کیونکہ پرکھل اس تکرار سے بہت لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس کی بیوفائی نے اُس کی بیوی کو ایک قابلِ رحم حالت تک پہنچا دیا ہے۔ دو عورتیں اس کے لیے چھین جھپٹ میں مصروف ہیں یہ تصوّر ہی اس کے غرور کو بلندی بخشتا ہے۔

ایک بھیانک اکٹوپس نے روشنی کی شہ رگ پر حملہ کر دیا ہے۔ قطرہ قطرہ خون رِستا جا رہا ہے۔ روشنی کا دم گھٹ رہا ہے لیکن اس کے علاوہ کہاں جائے کیا کرے اور آج پرکھل سے ہونے والی فیصلہ کُن بات چیت کو وہ کِس خانے میں فِٹ کرے۔ کوئی غصّہ نہیں تھا، کوئی تناؤ نہیں تھا۔ پرکھل کا موڈ اچھا تھا اور انداز پُر محبت۔

"دیکھو روشنی! یہ چھوٹی چھوٹی باتیں مائنڈ کرنا چھوڑ دو۔ میں تمہارا کتنا خیال کرتا ہوں۔ سارا روپیہ تمہارے ہاتھوں میں رکھتا ہوں۔ میں تمہارے انتظامات میں کب دخل دیتا ہوں۔ پھر تم کیوں سوچتی رہتی ہو کہ میں باہر کیا کرتا ہوں۔ گھر اور باہر کے فرق کو پہچانو! مجھے کچھ آزادی دو۔"

کِس آسانی سے اُس نے بیوی کو طوائف کے درجہ تک پہنچا دیا ہے۔ پیسہ ہی اس کو دیا جا سکتا ہے اور اس پر اُسی کا دعویٰ ہو سکتا ہے۔ غصّہ کمزوری کی نشانی ہے اور آنسو مجبوری کی۔ روشنی کمزوری اور مجبوری کو عیاں نہیں کرنا چاہتی۔ گلا صاف کر کے کہتی ہے۔ "اس آزادی کی تمنا مجھے بھی تو ہو سکتی ہے۔" پرکھل کی خوش مزاجی پَل بھر میں ہوا ہو جاتی ہے۔ "خواہ مخواہ کی حُجت بازی تمہیں تمہارے پروفیسر باپ نے ہی سکھائی ہوگی، اس بیوقوفانہ بحث کو میرے آگے نہ چھیڑنا۔ تمہارے کرنے کے اور بہت سے کام ہیں۔ تمہیں میرے سلسلے میں سوچنے کی ضرورت نہیں۔

پرکھل جوتوں کے فیتے باندھ کر پھر کلب چلا جاتا ہے، اب روشنی اس دُنیا میں معلق رہ جاتی ہے جو جنت اور جہنم کے بیچ کہیں ہے۔

بات سیدھی سی ہے۔ وہ اپنے ڈیڈی کے گھر جا سکتی ہے۔ اس قحبہ خانے سے دور کہیں بھی جا کر رہ سکتی

ہے۔ لیکن اپورو کا کیا ہوگا، ڈیڈی کے لیے بھی وہ بوجھ ہو جائے گی۔ بھابی کی آنکھ کی کرکری ایک طلاق یافتہ عورت یا شوہر کی ٹھکرائی ہوئی مشکوک کردار کی ہستی جسے شوہر نے ایک فٹ بال کی طرح اُچھال کر زمانے بھر کی ٹھوکروں میں ڈال دیا ہے۔ دستورِ ہند کی کئی جلدیں روشنی کی کتابوں کے ذخیرہ میں موجود ہیں۔ ایم۔فل۔ میں اس نے اپنے تھیسس کا عنوان ہی "خواتین کے مساوی حقوق" رکھا تھا لیکن دستورِ ہند شاید اس گھریلو دنیا کے برزخ پر لاگو نہیں ہوتا۔ اس کو مرنے اور جینے کے بیچ، جنت اور جہنم کے عین وسط میں اپنی زندگی کاٹنی ہے۔

⁂ ⁂ ⁂

# اے شامِ شہر یاراں

فیروز شاہ روڈ سے راج گھاٹ بہت دور ہے مگر میں ہفتہ میں دو بار وہاں پیدل جاتا ہوں! انشو کا سے ملنے! راج گھاٹ کی فضا بہت ہی خوش گوار ہوتی ہے لیکن وہاں جانے کی ایک اور بھی وجہ ہے ظاہر ہے کہ وہاں بیٹھنے میں کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ انشو کا سے روز ملنا بہت مشکل ہے۔ اُسے گھر واپس جاکر گھر کا کام کرنا ہوتا ہے۔ وہ ہفتہ میں دو بار ہی مل سکتی ہے لیکن میں گھر جلدی کبھی نہیں جاتا ہوں۔ اس پچیس ۲۵ گز کے پلاٹ پر بنا ہوا آدھا کچا اور آدھا پکا مکان، مشکل سے ہی گھر کہا جا سکتا ہے۔ میرے بھائی کے ادھ ننگے بچے اور بے بس آنکھوں والی خاموش طبیعت بھابھی کے قرب کے تصور سے ہی میری طبیعت بے کیف ہو جاتی ہے۔ پکچروں میں دیور بھابھی کے مذاق کے بہت سین دیکھے ہیں۔ اُن کے انس و محبت پر کئی فلمیں بنی ہیں۔ لیکن میری بھابی کو دیکھ کر ایسے تصورات پاش پاش ہو جاتے ہیں۔ اُن کے لبوں پر کبھی مسکراہٹ نہیں آتی بلکہ ایک مستقل سکوت ہے۔ اس خوفناک گھر کی بدصورتی دُھندلے بلبوں میں اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ مجھے ہر طرف سل و دق کے جراثیم اپنا پنجہ پھیلاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اسی لیے جب تک میں بھوک یا نیند سے بے قرار نہیں ہو جاتا، کبھی اس گھر میں جانا پسند نہیں کرتا۔ ساڑھے پانچسو روپیہ میری تنخواہ ہے اور چھ سو روپیہ بھائی کی اس میں میرے گھر کے اندر رہنے والے سات لوگوں کی گزر بسر کس طرح ہوتی ہے۔ یہ بھابی جانتی ہی ہوگی۔ میں نے تھرڈ کلاس ایم۔ اے۔ پاس کیا ہے اور بھائی صاحب نے آٹھویں پاس کیا ہے۔ وہ چپراسی

ہیں۔ میں اُن کی محنت اور قربانی کی بدولت ایم۔ اے کر چکا ہوں۔ مجھے پرائیوٹ کلر کی ملی ہے اور انھیں کافی عرصہ پہلے سرکاری دفتر میں چپراسی کی نوکری۔ کبھی ہم دونوں فرصت میں ہوتے ہیں تو آنے والے اچھّے دنوں کی بات کرتے ہیں۔ جو دور بہت دُور بھاگے جا رہے ہیں۔ پھر بھی ایک اُمّید ہے جو طرح طرح کے بھاوَنے لباسوں میں ہمارے سامنے رقص کرتی ہے۔ اُمّید کے سہارے میں اور بھیّا ہی نہیں کئی لوگ زندگی کو جھیل لیتے ہیں۔ یہ قید با مشقت کتنی لمبی ہے، کون کیا جانے ؟ انشو کا بھی پُر اُمّید ہے۔ ہر بار جب ہم ملتے ہیں تو ایسی اُمّید کی تجدید کرتے ہیں۔ ماں اور چھوٹے بھائی کے بوجھ سے دبی ہوئی انشو کا ستائیس سال کی عمر میں بھی اس بہتر مستقبل کی آس میں سرگرداں ہے اور میں اپنے شانوں کو شادی کی ذمّہ داری کے مقابل بہت ہی کمزور پاتا ہوں۔ لیجیے یہ راج گھاٹ آگیا۔ میٹھی سی غم آلود فضا ہے۔ تاج محل ہو یا راج گھاٹ۔ ان جگہوں پر موت کا تصوّر بھی سہانا بن جاتا ہے۔ یہ کوئی اس تاریک گھروندے میں جا کر دیکھے، جہاں بھیّا اور بھابی رہتے ہیں کہ جینا بھی ایک سزا ہے۔ میں گھاس کے میدان میں بیٹھ کر اپنے دُکھتے ہوئے پیروں کو آرام دینے کی کوشش کرتا ہوں۔ شام کا سانولا چہرہ سیاہی مائل ہو جاتا ہے۔ اچانک ہی سامنے سے انشو کا آجاتی ہے۔ ہلکی گلابی سوتی ساڑی ہے اور اس کے سیاہ بارڈر سے ملتا جلتا سیاہ بلاؤز ہے۔

تمام دن آفس میں کام کرنے کے بعد ساڑی گجل گئی ہے اور چہرے پر بھی تھکان ہے۔ اکثر اس سے ملتے ہی پہلا خیال آتا ہے کہ اس طرح شام کو اُسے بلا کر اور بھی زیادہ تھکا دیتا ہوں۔ آخر کب وہ گھر جائے گی۔ کب کھانا پکائے گی۔ کب بیمار ماں کو دوا پلا کر سُلائے گی۔ کب برتن دھو کر خود سوئے گی۔

انشو کا میرے قریب آکر مسکرانے کی کوشش کرتی ہے۔ میں اُسے پاس بٹھا لیتا ہوں۔ وہ اپنے خیالوں میں گُم ہے، میں اپنے خیالوں میں۔ جیسے ساری باتیں ختم ہو چکی ہیں۔ میں اسے غور سے دیکھتا ہوں چہرے کی تھکان شاید دفتر کے کام کا ہی نہیں بلکہ مہ و سال کی گردش کا بھی نتیجہ ہے۔ ہونٹوں پر جھرّیاں پڑنے لگی ہیں اور آنکھوں میں حلقے ہیں، ہاتھوں کی پُشت کی رگیں اُبھر آئی ہیں، زندگی گزرتی جا رہی ہے وہ اٹھائیس میں چھلانگ چکی ہے اور میں خود بھی تو تینتیس ۳۳ کا ہو رہا ہوں۔ بڑھاپا ہم دونوں کے تعاقب میں ہے۔ ہر قدم پر فاصلہ کم ہی ہوتا جا رہا ہے۔ میری اور اُس کی مشکلیں اس طرح برقرار ہیں۔ لاچاری کی انتہا ہے۔ یہ شاید مرنے اور جینے کے درمیان کا کوئی مقام ہے۔ مجنوں اور فرہاد کے لیے عشق میں مرجانا بہت آسان رہا ہوگا لیکن عشق میں جینا اور وہ بھی آٹھ گھنٹے ایک تنگ و تاریک آفس میں اور باقی وقت سیلن سے

بھرے بوسیدہ کوٹھری نما مکان میں کس قدر مشکل ہے۔ یہ مجنوں اور فرہاد کبھی نہ سمجھ سکے ہوں گے۔ میں موڈ ٹھیک کر کے انشو کا سے پیار بھری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس کے ناخنوں کے جوڑوں پر ایک کالا حاشیہ دیکھ کر گھبرا جاتا ہوں۔ یوں بھی اس کے کھُردرے ہاتھوں میں کوئی گداز نہیں ہے۔ مجھے اس سے محبت ہے، مگر کیا محبت میں گلیمر کا کوئی حصّہ نہیں ہوتا۔۔۔؟

خود میں بھی تو بوسیدہ پینٹ، پُرانی قمیص اور معمولی چپلوں میں ہوں۔ وہ بھی تو یہی سوچتی ہوگی۔ ایک عجیب سی گھُٹن ہمارے درمیان جگہ بنا لیتی ہے۔ میری خاموشی سے ہی اُکتا کر وہ بول پڑتی ہے ۔۔۔ "چلو راہل تھوڑا ٹہل لیں۔ میری چائے پینے کی خواہش ہے، مگر دو ڈھائی روپیہ خرچ ہو جائے گا۔ اس حالت میں تھکن اُتارنے کے بدلے بڑھانا نہیں چاہتا۔ میں صرف اتنا کہہ پاتا ہوں۔ "نہیں میں تھکا ہوا ہوں، یہیں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔" ماں کی طبیعت خراب ہے، میں جلدی جانا چاہتی ہوں۔" وہ دھیمے سے کہتی ہے۔ میرے دل و دماغ میں کڑواہٹ سی گھُل جاتی ہے کہ مجھے بھی تو بھائی صاحب کے بڑے لڑکے کے لیے پنسل اور ربڑ خریدنی ہے۔ بازار بند ہونے سے پہلے ہی اٹھنا ہوگا۔ میں خواہ مخواہ ہی آج دفتر میں ہونے والی دو کارکنوں کے درمیان لڑائی کا قصّہ اُسے سنانے لگتا ہوں۔ وہ سرکاری ہسپتال کے ڈاکٹروں کی بدزبانی اور بددماغی کے بارے میں اپنے تجربات سناتی ہے۔ جہاں وہ ماں کو لے کر گئی تھی۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تلخیوں کے اس انبار سے میٹھے بول ڈھونڈھ نکالنا تقریباً ناممکن ہے۔

کافی دیر ہو جاتی ہے۔ بھوک سے ہم دونوں کے چہرے مرجھانے لگتے ہیں۔ گھر میں آلو کی ترکاری اور ارہر کی دال میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ بازار بند ہونے کا وقت ہونے والا ہے۔ ہم دونوں اُٹھ جاتے ہیں۔ ہم دونوں کو آئی۔ ٹی۔ او۔ سے بس لینا ہے۔ کئی بڑے بڑے پوسٹر راستے میں نظر میں آتے ہیں۔ چمکتے ہوئے بلبوں کے حلقہ میں ایک عام سی فلم کا پوسٹر ہے۔ حسن و شباب کا پیکر ایک فلمی حسینہ ڈل لیک میں ایک شکارے میں سوار ہے۔ جواں سال ہیرو موٹر بوٹ میں اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ عقب میں سورج ڈوب رہا ہے۔

تمام سطح آب پگھلے ہوئے سونے میں ڈھل گئی ہے۔ پس منظر میں برف پوش پہاڑیاں کھڑی ہیں۔ میرے دل کی کڑواہٹ بڑھ جاتی ہے۔ میں اُچٹتی ہوئی نگاہ سے انشو کا کی طرف دیکھتا ہوں۔ ایک اُکتاہٹ بھری شام کی ساری بے کیفی اس کے چہرے پر منجمد ہے آنکھوں کے حلقے کچھ اور نمایاں ہیں۔ زلفیں بھوری ہو چلی ہیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم رہی ہیں۔ جلتے بجھتے قمقموں کے ہالے میں ہیرو ہیروئن ایک دوسرے کے تعاقب میں مصروف ہیں اور ہم دونوں اسی طرح بس اسٹینڈ کی طرف چلتے جا رہے ہیں۔ ٭٭٭

# بھیڑیوں کا شہر

گوردوارے کے سناٹے میں عطر کور کا وجود گھلا ملا سا لگتا ہے۔ سناٹا باہر اور اندر ایک جیسا ہی ہے۔ کبھی شور ہوتا ہے تو باہر اور اندر ایک جیسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ ہوائیں ٹھٹھرا دینے والی سردی اور جھلسا دینے والی گرمی تو لاتی ہی ہیں لیکن ہواؤں کے ساتھ صداؤں کا طوفان بھی آتا ہے۔ جس میں عطر کور تنکا بنی ڈولتی رہتی ہے۔ نیم پاگل، بدحال اور بوڑھی عطر کور ہواؤں کے دوش پر سوار نہ جانے کہاں سے کہاں نکل جاتی ہے۔

"عطیہ بیٹی اذان ہو رہی ہے"۔ لرزتی ہوئی آواز ماضی بعید سے آ رہی ہے۔ عطر کور حال کے دروازے سے نکل ماضی میں داخل ہوتی ہے۔

"ابا جی، بس اٹھ رہی ہوں پانچ منٹ میں۔ بہت سی آوازیں اور شور سب گڈمڈ ہو جاتا ہے"۔

صداؤں کے ہجوم سے ایک اور آواز ابھرتی ہے۔ "پریتم دی بے بے الماری سے روپیہ نکال دے بلبنی کے لیے جھمکے بنوانے ہیں"۔ روپیے تو میں نے پہلے ہی تمہارے کوٹ کی اندر والی جیب میں ڈال دیے ہیں۔"

شوہر کی مسکراہٹ کے جواب میں عطر کور بھی مسکرا دیتی ہے۔ دلبیر سنگھ کی مسکراہٹ اس کی کھچڑی داڑھی اور مونچھوں میں چھپ جاتی ہے۔ میونٹ بمشکل نظر آتے ہیں۔ عطر کور کے دل میں ایک مبہم سا خوف پھڑپھڑانے لگتا ہے۔ اس خوف کی جڑیں بھی صداؤں سے جڑی ہوئی ہیں۔ پاگل پن چھوت کی بیماری کی طرح پھیل رہا ہے۔ یہ روگ ایک سے دوسرے کو لگ رہا ہے۔ چھرے، بلم، بکر پانیں اور عطر کور کیا کیا بھول جاتے۔ ایک دور گزر جاتا

ہے لیکن اپنا مہیب آسیبی سایہ چھوڑ جاتا ہے۔ اس مسکراہٹ سے پہلی ملاقات اسی ماحول میں ہوئی تھی۔

مسجد کے مولانا منیر الدین زمین پر پڑے تھے۔ ٹخنوں سے اونچا پاجامہ لتھڑ رہا تھا۔ نماز کے گٹے سے بھی پیشانی دو حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ دلبیر سنگھ کے کندھے پر بڑی لڑکی کی آواز چیخ چیخ کر بیٹھ گئی تھی۔ پھٹی ہوئی آنکھیں ریگستان کی ریت کی طرح سوکھی ہوئی تھیں۔ مولانا کے کانوں میں عطیہ کی چیخیں بسی کی بسی رہ گئیں۔ ابا کے جسم کے دو ٹکڑے ہو چکے تھے، لیکن اماں اور چھوٹے بھائی پر کیا گزری، عطیہ کبھی نہ جان سکی۔

امرتسر کے ایک چھوٹے سے گاؤں کی عطیہ دلبیر سنگھ کی مسکراہٹ دیکھتے دیکھتے کب عطر کور بن گئی اُسے پتہ ہی نہ چلا۔ آوازیں تو ہمیشہ تعاقب کرتی ہی رہتی تھیں لیکن پریتم سنگھ کی ماں بن کر بچے کی کلکاریوں کی آواز ہر آواز پر غالب آگئی۔ پھر کچھ دن بعد ہربنس کور بھی واہ گرو نے بھیج دی۔ بیٹی کا باپ بن کر دلبیر سنگھ کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ اور دل میں گداز پیدا ہو گیا۔ پھول سنگھ کے آتے آتے عطر کور اور دلبیر سنگھ روایتی قسم کے میاں بیوی بن گئے۔ دلبیر نے عطر کور کو کوئی دُکھ نہیں دیا۔ لیکن دُکھ تو ہواؤں کے دوش پر آتے ہیں اور اُس کی آنکھوں میں جھانک جاتے ہیں، اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر جاتے ہیں۔

گھر گرہستی میں اس نے اپنی ہڈیاں گلا دیں۔ جیسے اس کی جان کا کوئی مول ہی نہ ہو۔ سال کے بعد سال گزرتے گئے۔ گوردوارے میں سر جھکاتے وقت اُسے شروع میں سفید مسجد یاد آئی تھی۔ جہاں کبوتروں کے غول کے غول بسا کرتے تھے اور جہاں اباجی کی آواز گونجتی تھی، لیکن کچھ دن بعد وہ اس طرح محو ہو کر شبد کیرتن سنتی جیسے کبھی وعظ سنا کرتی تھی۔

"بازگشت ہوا کے دوش پر سرسراتی آتی۔ "اے مسلمان بھائیو! قبر کے عذاب سے ڈرو اور اپنے ایمان سلامت رکھو۔ یاد رہے کہ سوال اور جواب کے بعد منکر نکیر اگر مردے کا ایمان سلامت نہیں پاتے ہیں تو بائیں طرف کی کھڑکی کھول دیتے ہیں، جہاں سے دوزخ کا بھیانک منظر اور جھلسا دینے والی ہوائیں آتی رہتی ہیں۔ اور وہ مردہ مسلسل عذاب میں گرفتار رہتا ہے۔"

کان بند کرنے کی عطر کور کو ضرورت نہیں۔ ہوا کے جھونکے کے ساتھ آواز دور چلی جاتی ہے۔ گرنتھی صاحب کے لب ہلتے ہیں۔

"ساری دنیا کی تخلیق ایک ہی نور سے ہوئی ہے۔ اس لیے ہم کسی کو اچھا اور کسی کو بُرا نہیں کہہ سکتے۔" اچھے اور بُرے کا فیصلہ کرنے کا اختیار تو اُسے کبھی ملا ہی نہیں۔ کسی کے سوال کے بغیر اُس نے ساری تلخی

چپ چاپ گلے کے نیچے اُتار کر لی تھی۔

امرتسر کے پاپڑ بڑیاں کھانے والی، ناک کی لونگ کے لشکارے دکھانے والی اور سڑک سڑک جانے والی ابھی مٹیار بن بھی نہ پائی تھی کہ عطیہ سے عطر کور بن گئی۔ زندگی کی کتاب کے پُرانے ورق پھاڑ کر اُس نے نئے ورق جوڑ لیے۔ پریتم اور ہربنس کور کب بچپن سے لڑکپن کی طرف بڑھ چلے، کب وہ کھٹولے سے اُٹھ کر سہرا باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ کب وہ امرتسر سے انبالہ اور پھر دہلی آ گئے۔ عطر کور کو ایک خواب کی سی کیفیت میں سب مراحل طے کرتی رہی۔ ہر چیز اس کے لیے نوشتۂ تقدیر بن کر آئی۔

دونوں بچوں کی شادیوں تک دلبیر سنگھ بھی پُرانی باتیں بھول چکا تھا۔ البتہ گرنتھ صاحب کے گرد پھیرے لیتی ہربنس کور کو دیکھ کر عطر کور ضرور حسد ہوا۔ اس کے حصہ میں نہ کوئی پھیرا آیا، نہ ایجاب وقبول کی سعادت، نہ سُرخ جوڑا، نہ بیلے گلاب اور چنبیلی کی لڑیاں۔ اپنے دل کا درد شام زندگی کی اس ساعت میں ظاہر بھی کیا کرنا تھا۔ اسی وقت دلبیر سنگھ نے اس کے کندھے پر ڈھارس بندھاتا ہاتھ رکھا۔ اُس کی نگاہ شوہر کی پگھلتی نگاہوں سے ٹکرائی۔ اُن آنکھوں میں نہ جانے کیا تھا کہ اس کی ساری عمر کی کلفتوں کا ازالہ ہو گیا۔

بنسی نے شوہر کے ساتھ اور پریتم سنگھ نے اپنی بیوی کے ساتھ الگ گھر بسا لیا۔ لیکن پھول سنگھ کی شادی ٹلتی ہی گئی۔ پھول نے پڑھنے میں بہت دلچسپی دکھائی۔ ٹھیکے دار دلبیر سنگھ کو یہ سب نرا پاگل پن لگتا۔ لیکن عطر کور کو انگریزی ادب میں ایم۔ اے۔ کی تیاری کرتا ہوا پھول بہت اچھا لگتا۔ جب وہ پڑھتا تو نظر بچا بچا کر وہ اُسے بہت دیر تک دیکھتی رہتی۔

کبھی کبھی ماضی کے دریچوں سے بہت سے پردے چیر کر ایک آواز آتی۔ "باجی! ماسٹر صاحب کہتے ہیں، میں ضرور انگلش کا اسکالر بنوں گا۔ میری انگلش بہت اچھی ہے۔" ان پڑھ عطر کور پھول کی کتابوں کو اس طرح سہلاتی رہتی۔ جیسے نوخیز شاکر کا سر سہلا رہی ہو۔ کوئی بتائے کہ ماضی کے کردار کس خون کے سمندر میں غرق ہو گئے۔

انگریزی ادب میں ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ پھر نوکری اور سب کے بعد خاموش طبع ذہن اور سنجیدہ پھول سنگھ کی شادی کی ساعت آ پہنچی۔ عطر کور نے اپنے من کی ساری اُداسی پھول سنگھ کی گہری آنکھوں میں بھر دی۔ سوچ میں ڈوبے رہنے والے اور خوابوں میں کھوئے رہنے والے پھول سنگھ کی آنکھوں میں کس کے خواب بستے ہیں۔ یہ عطر کور بن بتاتے ہی سمجھ گئی تھی۔ شادی طے کر دی گئی۔ صرف ایک ہفتہ باقی تھا۔

اُفق پر کالے بادل منڈلا رہے تھے لیکن عطر کور کے دل میں چراغاں ہو رہا تھا۔ پریتم اور بنسی کافی دن

پہلے ہی بچوں کے ساتھ آ گئے تھے۔ بنسی کا شوہر عین وقت پر آنے والا تھا۔ بنسی ماں اور بھائیوں کی دی ہوئی چیزوں کو بار بار دیکھ رہی تھی۔ گرنتھی صاحب اس دن کسی خاص کام سے آئے ہوئے تھے۔ اُن کی نورانی داڑھی دیکھ کر عطر کور کو بہت پرانے مولانا منیرالدین یاد آئے جن کو آخری بار اُس نے دو حصّوں میں تقسیم دیکھا۔ وہ کس طرح زخم کھانے کے بعد بھی عطیہ کی چیخیں سنتے ہوئے آگے بڑھے، کس طرح اُن کی لاش کی مردہ آنکھیں عطیہ کی بے حرمتی کی شاہد بنیں۔ عطر کور کیا کیا بھول جائے؟

وہ زمانہ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد دلبیر سنگھ نے اُسے کوئی دُکھ نہیں دیا۔ عطر کور نے بھی ساری تلخی کو اپنے اندر جذب کر لیا۔ وہ نہ جانے کب اپنی ماں، دادی اور ساس جیسی بُردبار بڑی بوڑھی بن گئیں اور اب پھول سنگھ اپنی پسند کی شادی کر رہا تھا۔ عطر کور ہنس رہی تھی۔ بنسی ماں اور بھائی سے فرمائشیں کر رہی تھی۔ عطر کور دل کھول کر ہنس رہی تھی۔ عام ہندوستانی عورتوں کی طرح عطر کور کے لیے بھی سیاست بے معنی تھی۔ اگرچہ ایک دن پہلے ہی سے ماحول خراب تھا، لیکن ڈرائنگ روم کی فضا میں وہی پُرانی گرم جوشی تھی۔

یکایک گردشِ ایام پیچھے کی طرف گھوم گئی۔ وہی صدائیں، وہی آوازوں کا ایک طوفان جو ہمیشہ عطر کور کا تعاقب کرتا رہتا تھا۔ جو خوابوں میں اُسے ڈراتا رہتا تھا۔ اچانک دروازہ توڑ کر اندر آ گیا۔ لاٹھیوں چاقوؤں اور دیسی طمنچوں سے لیس کچھ اجنبی چہرے اندر گھس آئے۔ عطر کور انہیں پہچان گئی۔ سینتیس سال پُرانی پہچان تھی۔ عطیہ ہو یا عطر کور، اجنبی لیٹروں کے لیے ایک ہی ہے۔

عطر کور اور بنسی کو بچانے کی کوشش کرتا ہوا دلبیر سنگھ دو حصوں میں بٹ گیا۔ گرنتھی صاحب کی پیشانی پر بھی وہی سُرخ پھول کھل گیا جو کبھی مولانا منیرالدین کی نمازی پیشانی پر اُبھرا تھا۔

عطر کور بے حس کھڑی تھی۔ حملہ آوروں کے دوسرے شکار پرتیم سنگھ اور پھول سنگھ تھے۔ پھول سنگھ کی خواب آلود آنکھیں بند ہوتے ہی عطر کور اپنے ہوش و حواس میں آ گئی۔ ہربنس اور من جیت کور کی چیخیں حملہ آوروں کو بوکھلا رہی تھیں۔ دو گولیوں نے ان کا بھی قصّہ ختم کیا۔ جب لوٹ شروع ہوئی تو عطر کور پھول سنگھ کی کتابوں کو بچانے دوڑ گئی۔ جاتے جاتے حملہ آور گھر کو آگ بھی لگا گئے۔

پانچ بڑی لاشوں اور چار بچوں کی لاش والے اَدھ جلے مکان میں عطر کور نجانے کس گناہ کی سزا کاٹنے کے لیے بچ گئی۔ حکومت کے حفاظتی دستوں نے اسے پھول سنگھ کی کتابوں پر اوندھا بے ہوش پڑا پایا تھا۔

گھر بنانا اپنی حفاظت کے لیے چار دیواری تعمیر کرنا اس کے لیے کتنا ضروری تھا۔ یہ کوئی کیا جانے حملہ آور

کے ہاتھ کو تھام کر ہی اُس نے ایک گھر بنایا۔ عطیہ سے عطر کور کا فاصلہ طے کیا لیکن کوئی کتنے گھر بسا سکتا ہے۔ مٹانے میں ایک دن بھی نہیں لگتا اور بنانے میں سینتیس برس لگ جاتے ہیں لیکن اب وہ کیا کرے اور کہاں جائے گھر چھن جانے کے بعد ریلیف کیمپ تک پہنچنا ہی عطر کور کی قسمت ہے۔ ایک بار آشیاں بکھرنے پر دوسرا بنا لیا تھا۔ لیکن اب پنچھوں میں اتنی طاقت کہاں۔ پنکھ ٹوٹ گئے۔ بگولے تنکے اُڑا کر لے گئے۔

کیمپوں میں کچھ دن بھٹکنے کے بعد وہ گُردوارے میں رہنے لگی۔ ہوش اور بے ہوشی کی سرحدیں ملی ہوئیں تھیں۔ کبھی وہ اِس پار ہو جاتی تو کبھی وہ اس پار۔

کئی مہینے بعد ہربنس کور کا شوہر بیوی اور بچوں کی موت کے غم سے اُوپر اُٹھ کر اپنی بوڑھی بیمار ساس کے پاس آیا۔ فلاحی ادارے کے سوشل ورکر نے اپنے مخصوص غیر جذباتی انداز میں اس سے بات کی، اور اُسے اپنے ساتھ گوردوارے میں لے آیا۔ عطر کور دھوپ میں بیٹھی خلا میں تک رہی تھی۔ وہ کبھی چھوٹے بھائی سے مخاطب ہو جاتی، کبھی اباسے، کبھی دیر سے تو کبھی پھول سنگھ سے۔ اس نے ریت سے مٹھیاں بھرنے کی کوشش کی تھی۔ ریت پھسل گئی اور وہ تہی دست ریت کے صحرا میں کچھ ڈھونڈتی رہ گئی۔ سُکھ اور دُکھ کے تانے بانے بُن کر اُس نے اپنے سر کو ڈھکنے کی کوشش کی تھی۔ وہ چادر بھی تار تار ہو گئی۔ اب وہ برہنہ سر زلزلے کے بازار میں کھڑی تھی۔ اس کی پھٹی ہوئی آنکھیں۔ کیا کہتے ہیں اس کے بند لب کیا شکوہ کرتے ہیں ـــــ کون سُنے، کون دیکھے ـــــ!

رنجیت کی آنکھیں دُھندلا گئیں۔ سوشل ورکر اپنے خاص پیشہ وارانہ انداز میں کہہ رہا تھا۔ دیکھیے مسٹر سنگھ اگر آپ انھیں لے جانا چاہیں تو ٹھیک ہے۔ ورنہ یہاں گردوارے میں اُن کا ری ہیبلٹیشن (آبادکاری) تو ہو ہی چکا ہے۔ ٭٭٭٭٭

# ایک نئی پُرانی کہانی

جب تک سب کچھ ایک بندھی ٹکی لکیر پر چلتا رہتا ہے ہندوستانی سماج چین کی سانس لیتا ہے۔ اس شادی میں بھی سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا کہ عام ہندوستانی شادی میں ہوتا ہے۔ سترہ سالہ بے حد نازک اندام دلہن بھاری ساڑی اور بھاری زیورات کے بوجھ سے دبی ہوئی۔ بے ترتیبی، غل غپاڑہ، شور، ہاہا، قہقہے، بچوں کا رونا اور لڑکیوں کا کھکھلانا، بادامی بنارسی ساڑی میں بھاری بھرکم ساس لدی پھندی احکامات صادر کر رہی تھیں۔

گھونگھٹ نے آنسو، بیزاری اور سر کا درد سب کچھ چھپا لیے تھے۔ انٹر فائنل کے امتحان کی تیاری کرتی ہوئی سنندا کو اس طرح اگنی کنڈ کے سامنے بٹھا دیا گیا کہ کالج کی کتابیں اور کاپیاں بڑی اجنبی نگاہوں سے اُسے دیکھتی رہ گئیں۔ اُس کے دل میں خوف کے سوا کوئی جذبہ نہ تھا۔ وہ سوچتی رہ گئیں کہ شاید یہ وحشتناک خواب ثابت ہو۔ لیکن یہ خواب ساری عمر پر محیط تھا۔ اب اُسے ہمیشہ گھونگٹ میں منھ چھپائے رہنا ہوگا۔ ہمیشہ ساڑی پہنتی ہوگی۔ دُنیا بھر کی بندشیں اور کمر توڑ کام ہوگا۔ سنندا جان گئی تھی کہ آئندہ اُسے مر مر کے جینا ہوگا۔ بادِ صبا کی طرح کچھ خوشگوار لمحے وہی ہوں گے جو وہ میکے کے گھر میں ہارسنگھار کے درخت کے نیچے کھڑی ہوگی۔ تعلیم جسے آج تک وہ اپنی زندگی کا مقصد سمجھ رہی تھی، اس کی ماں اور پتا جی کی نظر میں صرف انتظار کے وقفے کا نام تھا۔

عجیب عجیب رسومات، منہ دکھائی، تبصرے فقرے ہر طرف سے زیورات کھینچ کر دیکھنا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں وزن تولنا۔ بھوکی پیاسی سنندا بے ہوش ہونے لگی۔ گرمی اور پسینے سے شرابور دلہن کے حلق میں پیاس سے کانٹے پڑ رہے تھے اور گلے میں آنسوؤں کا پھندا پڑ رہا تھا۔ پھر بھی وہ اپنے دل کو سنبھال رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ نیلامبر سے ملاقات کے بعد شاید دل کو ڈھارس بندھے اور شاید وہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر رو سکے۔ الھڑ اور بھولی ہونے کے باوجود اُس کا دل میاں بیوی کے رشتے کی گہرائی سے واقف تھا۔

وہ وقت بھی آیا، لیکن اُمیدوں کا نیلا آکاش نظر نہیں آیا۔ جو گھٹا تُلی کھڑی تھی وہ اور بھی گھنیری ہو کر نیچے جُھک گئی۔ نیلامبر نے بہت ہی صاف اور دو ٹوک انداز میں کہا۔ "سنندا اس گھر میں جو بھی ہے بس ماں ہے۔ پتاجی نوکری کی وجہ سے زیادہ تر سفر میں رہتے ہیں۔ بڑے بھیا الگ ہو گئے ہیں۔ دیدی نانیجیریا میں ہیں۔ مجھے ہمیشہ ماں کے ساتھ ہی رہنا ہے۔ مجھے خوش کرنے کے لیے بس ماں کو خوش کرنا تمہارا فرض ہے۔"

سنندا کا جھکا ہوا چہرہ اور جُھک گیا۔ فرض کا لفظ ایک ہتھوڑے کی طرح اس کے کان پر لگا۔ وہ جانتی تھی اُس کی آئندہ زندگی کا محور صرف یہی ایک لفظ ہو گا "فرض" سوالوں کا ایک ہجوم اُس کے دماغ کے دروازے کھٹکھٹاتا رہا۔ سوال پوچھنا اس کا فرض نہ تھا۔ بلکہ صرف عمل کرنا اس کا کام تھا۔ سنندا اگلے دن مائیکے گئی۔ لیکن وہاں بھی گُم سُم سی رہی۔ اس کی نرمل جھرنے کی سی ہنسی تو غائب ہو گئی تھی۔ وہ سہیلوں کے ساتھ مسکرا بھی نہ سکی۔ اُس کے آنسو بھی سُوکھ گئے۔ رخصت کے وقت ماں نے گلے لگا لیا، لیکن وہ پتھر بنی رہی۔

دن کا کام ہے۔ گزرنا بس گزر ہی جاتے ہیں، اور رات وہ ایک نیم خواب کیفیت کا نام ہے۔ تنویم زدہ وجود بس احکامات پر عمل کرنا جانتا ہے۔ دماغ کا لاوا کبھی ہونٹوں سے باہر نہ نکلے۔ ہونٹ بند رہیں۔ کبھی کراہ بھی نکلے تو دردہ زہ کی۔ کیونکہ خاموشی اور فرماں برداری ہی عورتوں کے گُن ہیں۔

فاراتُنی دیوی ان ساسوں میں سے نہ تھی جو کہ بہو کے آنچل میں دیا سلائی لگا کر قصہ ختم کر دیتی ہیں بلکہ وہ ان عورتوں میں سے تھی جنہیں اپنی بہو سے تمام عمر کی ناکامیوں، حسرتوں اور گھٹن کا انتقام لینا ہوتا ہے۔

طباق سے چہرے والی تھل تھل کرتے جسم کی بھیانک ساس سرکس کے رنگ ماسٹر سے کم نہ تھی۔

اس کے اشاروں پر سارا گھر ناچتا۔ سنندا کی بے عذر اطاعت شعاری اُسے اپنے لیے ایک چیلنج سی لگتی رفتہ رفتہ اس نے اپنی سختیوں کا دائرہ بڑھانا شروع کر دیا۔ سنندا کا سارا جہیز تو شروع سے ہی اُس کے قبضے میں تھا۔ سنندا نے اس میں کبھی دلچسپی بھی نہیں لی۔ زیور اُتروا کر اُس نے تجوری میں رکھ لیے اُس پر بھی سنندا چُپ رہی۔ رات میں جب نیلامبر سونے کے لیے جاتا، تو سنندا ساس کی ٹانگیں دباتی رہتی۔ نیلامبر نے پہلے ہی دن جو ماں کی خدمت کی، تاکید کی تھی۔ اس کو سنندا نے گرہ میں باندھ لیا۔ میاں بیوی کے تعلقات گہرے نہ ہو سکے۔

سنندا کو رسالے پڑھنے اور ریڈیو سننے کا شوق تھا۔ نارائنی دیوی اسے کھلے عام بے غیرتی اور بے حیائی کہتی رہی۔ بہو ہمیشہ ساس کی پرانی رنگ اُتری ہوئی ساڑیاں پہنتی رہتی جبکہ نارائنی اُس کے جہیز کی ساری ساڑیاں استعمال کرتی رہتی۔ گھر گرہستی کا کُل کام، صفائی، کپڑے دھونا، کھانا پکانا، برتن دھونا کرتے کرتے سنندا کا روپ دُھندلا گیا۔ ہاتھ سخت ہو گئے۔ پھر بھی نارائنی ہر ایک کے سامنے نکمی اور پھوہڑ بہو کا رونا روتی رہی ـــــ دوپہر میں سونا نارائنی دیوی کی بڑی بے کار بات لگتی۔ اس لیے دوپہر میں مصالحہ کوٹنا، پاپڑ بڑیاں بنانا، اچار ڈالنا، رضائیاں اور سوئٹر تیار کرنا وغیرہ چلتا رہتا لیکن نارائنی دیوی نیلامبر کے سامنے ہمیشہ سنندا سے لیے گئے کام میں خامیاں نکال کر گھنٹوں بکتی رہتی۔ وہ ہر کام کروا کر ہمیشہ یہ ثابت کرتی رہتی کہ وہ ہر کام خود کتنی اچھی طرح کرتی تھی۔ لیکن وہ بھول ہی گئی تھی، کہ باپ بننے کا شرف دینا ماں کا نہیں بلکہ بیوی کا کام ہے۔ سنندا کے اُمید سے ہونے کی خبر سنتے ہی وہ کتنی کڑوی ہو اُٹھی تھی۔ ہر وقت آج کل کی لڑکیوں کی بے حیائی کا رونا روتی رہتی۔ سنندا کے ماں بننے کے عمل کو وہ بے غیرتی سمجھتی، طبیعت کی خرابی کو ڈھونگ سمجھتی۔ نارائنی دیوی نے اس قدر بے شرمی کا الاگ الاپا کہ سنندا کو نیلامبر کے شکل دیکھ کر ڈر لگنے لگا۔ ساس کو بہو سے جو گہری نفرت تھی اُس کی جڑیں نیلامبر کی محبت میں پوشیدہ تھیں۔ اس محبت کے چھن جانے کے ڈر نے اُسے بہو کی شیرنی جیسا غضب ناک بنا دیا۔

سنندا نے آنگن میں بیلا لگایا۔ صبح میں انہیں پانی دینا، کیاریاں ٹھیک کرنا، ایک ایک پھول پتی کو سنوارنا اور اُن کی مہک کو اپنے اندر اتارنا۔ سنندا کی زندگی میں یہی لمحات اُس کے اپنے ہوتے تھے۔ ساس کے ڈر سے اُس نے کبھی کچے آم یا نیبو کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ سارا کھانا خود پکانے کے

باوجود اس میں خود نکال کر کھانے کا اختیار نہیں تھا۔ ساس اُسے ہمیشہ پھیکا سیٹھا اور باسی کھانا ہی دیتی۔ ایسے میں اسے بیلے کی خوشبو سے ہی کچھ تسکین ہوتی۔ لیکن ساس اسے پودھوں کے پاس کھڑے ہو کر گہری سانس بھی لیتے دیکھ لیتی تو وقت ضائع ہونے کا رونا رونا شروع کر دیتی۔

یوں پیتامبر نے زندگی کا اُجالا دیکھا۔ ساس نے سنندا کو مائکے نہیں جانے دیا۔ سنندا کو یرقان ہو گیا اور نومولود بچہ بھی بیمار ہو گیا۔ زچّہ کو حلوے اور مقویات دینے کا سوال ہی نہ تھا۔ ایک دن اُسے سوکھی دال روٹی کھا کر اُٹھتے دیکھ کر نیلامبر ماں سے بول پڑا۔ "یہ کیا کرتی ہویں اتنے سیب، سنترے کس کے لیے لاتا ہوں۔ "وہ سب ٹھنڈ کرتے ہیں"! نارائنی غصّے سے تپ کر بولی۔

وہ خود ہی سیب و سنترے اُٹھا لایا اور سنندا کے پاس ہی بیٹھ کر چھیل چھیل کر اُسے کھلانے لگا نارائنی دیوی کی چیخ پکار سُن کر پڑوسی بھی آ گئے۔ نیلامبر نے زندگی میں پہلی بار ماں کا سامنا کیا۔ "سیب کھلانا، دکھانے کے لیے کیوں بلا رہی ہو۔ یہ دیکھنے کے لیے بُلاؤ۔ کہ تم دس دن کی زچّہ کو کیا کھِلا رہی تھیں۔ حیران سنندا مشینی انداز میں کھاتی رہی۔ نیم بے ہوشی کے عالم میں سنندا کی پتھریلی آنکھوں سے بہت دن بعد آنسو نکل پڑے۔ یہ خواب سنندا نے کئی بار دیکھا تھا۔ سنندا نے آنکھیں نہ کھولیں کہ کہیں خواب نہ ٹوٹ جائے۔

پڑوسی دروازے سے جھانک کر دیکھتے رہے۔ چیخ چیخ کر نارائنی کا حلق دُکھ گیا۔ وہ ہسٹریائی انداز میں روتی رہی لیکن اس دن کے بعد نارائنی کا چیخنا کچھ کم ہو گیا۔

اس کے بعد آتی ہوئی سردیوں میں ایک دن نارائنی پر فالج کا اثر ہو گیا۔ داہنے ہاتھ پَیر اور زبان کی حرکت بند ہو گئی۔ اس کا علاج چلتا رہا لیکن وہ صرف پلنگ پر مقید ہو گئی۔ اس کی آواز بند ہونے سے گھر میں سکون سا چھا گیا۔ گھر والوں کی سماعت واپس آ گئی۔ لیکن سنندا بڑی میٹھی آواز میں لوری گانے لگی۔

دھیرے دھیرے سنندا نے کام سنبھال لیا۔ جس میں سب سے ضروری کام مفلوج ساس کے پلنگے سے چابیاں کھول لینا ہی ہو سکتا تھا۔ ساس اور بچے کی وجہ سے کام بہت بڑھ گیا تھا۔ اس لئے ایک مہری گھر کے کام کے لئے رکھ لی گئی۔ نارائنی بہت چھوت چھات پرستی تھی۔ لیکن اب وہ خود ہی ہر وقت گندگی کا ڈھیر بنی پڑی رہتی کوئی

کہاں تک صاف کرتا۔ دھیرے دھیرے پیتا مبر بڑا ہونے لگا۔ تب ہی کرن کی آمد آمد ہوئی۔ اس بار سنندا نے اپنی پسند کی ہر چیز کھائی۔ نیلا مبر نے پھل لا لا کر ڈھیر لگا دیے۔ کرن آئی تو نیلا مبر کا منہ اُتر گیا اور بابو جی کھسیانی ہنسی ہنس کر بولے "چلو لکشمی آئی ہے۔" گھر کی مہری نے مایوسی چھپاتے ہوئے کہا۔ "سہاگن براجی ہے۔" یہ الفاظ سنتے ہی نیلا مبر جیسے دوگنا بُردبار اور ذمّے دار ہو گیا۔ وہ بچوں میں پوری طرح دم گیا۔

یہی انچاہی بیٹی باپ کے دل کا سب سے نرم گوشہ بن گئی۔ سنندا نے ننھی کرن کو چھوٹی سی پائل پہنا دی مدھم مدھم جھنکار سے باپ کے دل میں پیار کی گنگا بہنے لگتی۔ اس ساری مصروفیت میں نیلا مبر کے پاس گونگی اور مفلوج ماں کے لیے کوئی وقت نہ ہوتا۔ ماں کو دیکھ کر ایک گھن بھرا رحم کا جذبہ ابھرتا۔ وہ گھبرا کر فوراً وہاں سے اُٹھ آتا۔ علاج سے ماں کچھ ٹھیک ہونے لگی، لیکن ایک پیر اور زبان بالکل مفلوج ہو گئے تھے —

وقت گزرتا گیا۔ سنندا نے شادی کے آٹھویں سال ایک اور بیٹے کو جنم دیا۔ نام نہ سوجھنے پر سب اُسے منا کہنے لگے۔ نیلا مبر کی نچی مونچھیں پھر اونچی ہو گئیں۔ سنندا ریشم کے کیڑے کی طرح تھی، جس کی اہمیت اس کی تخلیق سے ہی ہوتی ہے۔ لیکن ریشم کے کیڑے کی طرح سنندا کا دم اپنی تخلیق کے بوجھ سے نہ گھٹتا۔ سنندا اب گھر کی مالکن بن چکی تھی۔ ساس کے ذرا سا بھی چوں کرنے پر وہ اُسے ہزاروں باتیں سنا کر رکھ دیتی۔ نیلا مبر اسے روز کا معمول سمجھتا تا بابو جی بھی ماں کے کمرے میں سمٹ کر رہ گئے تھے۔ بہورانی گھونگٹ کی آڑ میں اُن کے سامنے بھی بڑبڑاتی رہتی۔ بابو جی بدمزاج بہورانی کے بڑبولے پن سے بہت گھبراتے تھے۔ خاموش اور ڈری سہمی بہورانی کب اتنی بدمزاج ہو گئی۔ یہ سب تبدیلیاں قبول کر لی گئیں۔ کوئی نہیں دیکھ پاتا کہ کب انکور پھوٹا کب پودا کب تناور درخت میں تبدیل ہو گیا۔

سنندا کو زیور اور کپڑے کا ہوکا سا ہو گیا تھا۔ اب گھر کا کام نوکر کرتے تھے۔ روز صبح وہ سج دھج کر اچھی طرح تیار ہو جاتی۔ ایک ادا کے ساتھ وہ بندی اور سیندور لگاتی۔ نارائنی دیوی کے حصے میں پُرانی ساڑیاں آئیں۔ نارائنی دیوی کو کبھی بہو کو دودھ اور پھل دینا بہت اکھرتا تھا۔ اُن کا قول تھا کہ دودھ اور پھل تو دماغی کام کرنے والوں کے لیے ہوتے ہیں۔ یہ عورتیں کم بخت کون سا دماغی کام کرتی ہیں۔ اب سنندا پھل تقسیم کرتے وقت ساس کو بالکل بھول جاتی اور کوئی دلیل دینے کی بھی ضرورت نہ سمجھی۔

سنندا ہر سال سونے کی چوڑیوں اور کڑوں کو بدل کر بڑے کڑے اور چوڑیاں لیتی۔ اس طرح اُسے

اپنے موٹے ہونے کا احساس ہوتا۔ وہ اب ایک شاندار اور پختہ قار عورت بن گئی تھی۔ گالوں پر گلابی، ہونٹوں پر لالی، ہاتھوں میں کنگن، گلے میں موٹی سی چین میں لٹکتا لاکٹ۔ کراری آواز میں احکامات صادر کرتی۔ وہ پُررعب عورت لگتی۔

ایک صبح ہی صبح نیلامبر کی آنکھ کھل گئی۔ سنندا کے زور سے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ ”دیکھا سارا دہی گرا دیا۔ جب کام ہوتا نہیں تو چولے میں آتی کیوں ہو؟ ـــــ نیلامبر سنتا ہی رہ گیا۔ الفاظ نئے نہیں تھے۔ کبھی ماں اسی طرح پھٹکار کے ساتھ سنندا کی صبح کی شروعات کرواتی۔ اب مکالمے وہی تھے لیکن اداکار بدل گئے تھے۔ نیلامبر دیکھتا ہی رہ گیا۔ ماں سر جھکائے کھڑی تھی۔ سنندا بڑبڑا رہی تھی۔ اُسے پتہ ہی نہیں چلا کب ماں اتنی دُبلی پتلی اور لاچار ہو گئی۔ اور کب سنندا کا چہرہ اتنا بھر گیا۔ کب اس نے ماں کے لہجے میں بولنا سیکھا اور وہ خود ـــــ؟ اس سات سالوں میں اس نے کون سا رول نبھایا۔ اس کی خود کی اہمیت ہی کیا تھی۔ دونوں عورتیں اسے استعمال کرتی رہیں۔ مرد گھر سے باہر بیل کی طرح کام کرتا ہے لیکن اُس کی نکیل ہمیشہ عورت کے ہی ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ماں ہو یا بیوی۔ مرد عورت کے سامنے کتنا بے بس ہوتا ہے جب اسے اپنی بے بسی کا احساس ہوتا ہے تب تک دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ اور وہ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چشمہ اُٹھاتا ہے اور اخبار کا اسیر ہو جاتا ہے۔ عورت کی حکمرانی کا دائرہ بڑھتا رہتا ہے اور مرد سمٹ کر صرف آرام کرسی تک محدود ہو جاتا ہے۔

نیلامبر کو اپنی ذات کا عرفان ہو رہا تھا۔

# انسان اور سُرخ بِلّا

میں نے بچپن سے بہت سے پلے بلیاں پالی ہیں۔

مجھے بلیاں بہت اچھی لگتی ہیں۔ ان کا بچپن بڑا دلکش ہوتا ہے۔ آنکھیں بند ہوتی ہیں۔ ٹاک ٹوئیاں مارتے ہوئے وہ راستہ بناتے رہتے ہیں۔ اُن کے ہونٹوں سے نکلتی ہوئی معصوم آوازیں بچپن کی شوخی شرارت اور اُچھل کود کتنی پیاری لگتی ہے۔ رفتہ رفتہ جب آنکھیں کُھلتی ہیں تو پہلی یا بھوری آنکھیں بڑے واضح اشارے کرنے لگتی ہیں۔ اندھیرے میں گھات لگاتی ہوئی ہیروں کی طرح چمکتی ہوئی سبز آنکھیں اور جست لگانے کے لیے تنا ہوا جسم ایسے مسحور کُن لگتے ہیں کہ آنکھ نہیں ہٹتی۔ میری توجہ اور دیکھ بھال کے سبب بلّی کے بچے بڑے ہوتے لگتے ہیں اور خوب طاقت ور بھی ہو جاتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بلّی کے کئی بچے ایک ساتھ پیدا ہو جاتے ہیں۔ میں سب کی دیکھ بھال کرنا چاہتا ہوں۔ سب کو کھانے کے لیے راتب دیتا ہوں لیکن ایک جو سب سے طاقت ور ہوتا ہے۔ وہ سب کو ہٹا کر سب کچھ کھا جایا کرتا ہے۔ میں یہی سوچ لیتا ہوں کہ یہ قانونِ فطرت ہے۔ وہ اکثر اپنے بھائی بہنوں کو بھی نوچ کر کھا جاتا ہے اور موٹا ہوتا جاتا ہے۔

بچپن کے بعد جوانی اور جوانی کے بڑھاپا، یہ بھی قانون قدرت ہے۔ بوڑھا ہونے سے پہلے ہر بلّا اور بلّی ایک نئی نسل تیار کر لیتے ہیں لیکن وہ خود کتنے کریہہ المنظر ہو جاتے ہیں۔ لٹکا ہوا پیٹ

نحیف ٹانگیں، گھائل اور مضروب جسم کمزوری اور لاغری کی تصویر بچے طاقت ور ہو جاتے ہیں اور بوڑھی بلی گھناؤنی اور کمزور بڑھاپے میں وہ تیزی سے موت کی طرف کھسکتی ہے۔ یہ اس کے حق میں اچھا بھی ہوتا ہے کیونکہ اس کے اپنے بچے ہی اس کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ اس کی موت کو قریب دیکھ کر اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہیں۔ اُس کی موت کے بعد اُس کی تکہ بوٹی کر کے کھا لیتے ہیں۔ وہ بوڑھی اور بیکار ہوتی ہے مگر پھر بھی اُسے کھا کر اُن میں نئی جان آجاتی ہے۔

ایک عرصے تک یہ سب اسی طرح چلتا رہا، یہاں تک کہ میں خود بچے سے جوان ہو گیا لیکن یہ شوق کم نہیں ہوا بلکہ اس پر اور بھی جلا آگئی۔ بلی کے بچے جلدی جلدی پیدا ہونے لگے اور جلد جوان ہو جاتے۔ جلد ہی فنا سے ہمکنار ہو جاتے۔ میں اُن کی افزائش نسل کے مختلف تجربہ کرتا رہا۔

آخر کار ایک دن ایک ایسا بچہ پیدا ہوا جس کا سُرخی مائل آتشی رنگ بے حد دلفریب تھا۔ وہ بہت پھرتیلا اور چنچل تھا۔ وہ شروع سے ہی غیر معمولی طور پر چست و چالاک تھا۔ اس میں ایسی دلربائی تھی جو دیکھتا اس کا گرویدہ ہو جاتا۔ محلہ پڑوس یہاں تک کہ تمام شہر میں اُس کی دھوم مچ گئی۔ وہ بھی ہر ایک سے مانوس ہو جاتا۔ سب یہی کہتے کہ ایسا بلا ہم نے آج تک نہیں دیکھا، اب اور بلوں کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں۔ عدم توجہی کی وجہ سے اور سب بلیاں رفتہ رفتہ کمزوری کا شکار ہو کر ختم ہو گئیں۔ سارا گھر اسی کی دیکھ بھال میں لگا رہتا۔

وہ بڑھنے لگا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور پیار بھری آواز میں خر خر کرنے لگا۔ وہ بڑا ہوا اور بچپن کی شرارتیں چھوڑ کر سنجیدہ ہونے لگا۔ وہ بڑا بہادر اور نڈر تھا۔ اس کی معصومیت کے شیدائی اب اس کی سطوت سے مرعوب ہو گئے لیکن میرے دل میں کھٹک سی پڑ گئی۔ اب وہ جوان ہو گیا ہے۔ لاکھ طاقت ور سہی لیکن بہت جلد وہ بوڑھا ہو جائے گا اور بیکار ہو کر عضو معطل ہو جائے گا۔ یہ خیال ہی میرے لیے وحشت ناک تھا۔ کاش میں اس کی جوانی دائمی بنا سکوں۔ میں یہی سوچتا رہتا۔ میں نے اس کی صحت کا حد درجہ خیال کرنا شروع کر دیا۔ اس بیچ میں جو چھوٹے چھوٹے بچے پیدا ہوئے وہ بھی اُسے کاٹ کر کھلا دیتے۔ وہ اور اس کی سلامتی میرے لیے لازم و ملزوم ہو گئے۔ میں اُسے نہ صرف دائمی زندگی بلکہ دائمی جوانی بھی دینا چاہتا ہوں۔ اس کی جوانی لمبی ہوتی گئی۔ یہ سب میری دیوانہ وار کوششوں کا نتیجہ تھا۔ وہ تندرست توانا جوان بن گیا۔ غیر معمولی طاقت کی وجہ سے اُس کی حرکتیں

معصومانہ ہونے کے ساتھ ساتھ تخریبی بھی ہونے لگیں۔ لیکن سب اس کے دیوانے تھے۔ وہ سب کا چہیتا تھا۔ کیونکہ چوہے، چھپکلی اور ہر طرح کے مکروہ موذی کیڑوں مکوڑوں سے وہ ہماری حفاظت بھی کرتا۔

پھر رفتہ رفتہ گھر والوں نے تو نہیں لیکن باہر والوں نے اس کے خلاف زیر لب سرگوشیاں شروع کر دیں۔ اس نے آس پاس کے گھروں کے چوزے اور کبوتر جیسے بے ضرر جانور بھی کھانا شروع کر دیے۔ دن بدن اس کی شرارتیں بڑھتی گئیں۔ لیکن میں خاموش تھا۔ یہ سب زندگی حرکت اور حرارت کی علامت تھی۔

اِس طرح اسی میں مدغم ہوئے کافی وقت گزر گیا۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ مجھے اُس کی توانائیاں کچھ گھٹتی نظر آئیں۔ میرا دل رنج و غم سے بھر گیا۔ میں نے دیکھا کہ کچھ چھوٹے چھوٹے بلونگڑے بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ میں نے ان کو گھر سے نکال دیا۔ اور اپنے سُرخ بلّے کی دیکھ بھال میں لگ گیا۔ بلّا بوڑھا تو نہیں ہوا تھا، دراصل ادھیڑ بھی نہیں ہوا تھا لیکن اس جنون میں گرفتار ہو گیا تھا کہ کہیں اور کوئی بلا نظر نہ آئے۔ دوسرے بلوں کو دیکھتے ہی وہ جھپٹ پڑتا۔ اس کی پیار بھری خرخر بند ہو گئی تھی۔ اب اُس نے ہر کسی پر غرّانا شروع کر دیا۔ اب پڑوسی صاف صاف اُس کی شکایت کرتے اور مجھے بھی اُس کی حرکتوں کے لیے ذمّہ دار قرار دیتے۔ میں تو چپ رہتا لیکن وہ سب کچھ سمجھتا تھا۔ وہ ضرور موقع پا کر ان لوگوں کو کاٹ کھاتا۔ عمر ڈھلنے کے ساتھ ساتھ وہ بھی تند خو ہوتا گیا۔ میرے پڑوس میں ایک بزرگ رہتے تھے وہ بھی جانور پالتے تھے۔ ایک دن انھوں نے مذاق میں مجھ سے کہا۔

"ارے بھئی! اس کو پٹہ ڈال کر رکھو ورنہ یہ تمہارے گلے میں پٹہ ڈال کر تمہاری نکیل خود پکڑ لے گا۔"

بڑے میاں کی یہ باتیں سنتے ہی میں ایک دم گھبرا گیا۔ بڑے میاں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ بلا اب مجھ پر بھی غرّانے لگا تھا۔ میں اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام کر نہیں پاتا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ میرا مالک بنتا جا رہا تھا۔

آخر کار ایک دن میں نے ایک انقلابی فیصلہ کر ہی لیا کہ بس اب اور نہیں۔ کبوتروں اور چوزوں کے بعد اب اُس نے خرگوش اور میمنوں کو بھی زخمی کرنا شروع کر دیا تھا۔ جو بھی اس کی شکایت کرتا، اس کو بھی کاٹ کھاتا۔ میں نے دل کڑا کر کے بہت مضبوط اور خوشنما پٹہ اپنے ہاتھ سے بُنا، اور اُسے مضبوط زنجیر میں جوڑ دیا۔ بلّا رات کو چوکنی نیند سوتا تھا لیکن میں بھی اس کا آقا رہ چکا تھا۔ ایکدن اچانک سوتے ہوئے

بلّے کو پٹّہ سے باندھنے میں کامیاب ہوگیا۔ بلّا ایک چیخ کے ساتھ بیدار ہوگیا۔ وہ پٹّہ کو چبانے اور زنجیر توڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے شور سے میں کانپ گیا لیکن ہمّت باندھے رہا۔ بلّا کئی دن تک لاحاصل شور کرتا رہا لیکن میں لاپرواہ بنا رہا۔ رفتہ رفتہ وہ اس بندش کا عادی ہوگیا۔ وہ کمزور بھی ہوگیا تھا۔ وہ اب بھی ہر ایک پر حملہ کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اب یہ ممکن نہیں تھا۔

دھیرے دھیرے کر اور بلّے پیدا ہوئے، کچھ تو اس سے ملتے جلتے تھے۔ یقیناً اس کے بچّے ہوں گے وہ ہر بلّے کو دیکھ کر غرّاتا رہتا۔ لیکن پھر وہ اُن کا عادی ہوگیا۔ وہ ان کے ساتھ دھیرے دھیرے کھیلنے بھی لگا ــــ

وہ اب کمزور ہو رہا ہے اور دوسرے بلّے طاقت ور ہو رہے ہیں لیکن میں ڈرتا ہوں کہ کہیں وہ اپنے پر قوت نہ ہو جائیں۔ اب بلّے پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ کمزور اور کچھ شہ زور۔ وہ جوان ہوتے ہیں اور پھر فنا ہو جاتے ہیں۔ میں اس پر کوئی ملال نہیں کرتا۔ میرا سُرخ بلّا موجود ہے۔ مجھے اس سے پیار بھی ہے۔ وہ بہت انوکھا بلا تھا۔ وہ نہ بھی رہے لیکن اس کے بچے موجود ہیں۔ وہ دوسرے بچوں کے ساتھ مل کر کھیلتے ہیں۔ میں سمجھ گیا ہوں، اب کسی بھی بلّے کا آسیب بن کر اعصاب پر سوار ہونا مجھے پسند نہیں ہے۔ اب میں کسی بھی بلّے کو اپنا مالک نہیں بننے دوں گا۔ جب وہ قابو سے باہر ہوں گے میں انھیں پٹّہ ڈال کر اسیر کر لوں گا۔

٭٭٭

# آج غمگیں ہیں ہم

بے کیف، صبح و شام۔ اُکتا دینے والے معمولات ایک بار آفتاب پھر نکل آیا گردش ہی گردش ہے اس کے نصیب میں۔ تھکتا ہی نہیں۔ بچپن میں اماں بی کہانی سُنایا کرتی تھیں کہ سُورج سولہ گھوڑوں کی بگھی میں سوار ہو کر نکل پڑتا ہے۔ سونے کے گھوڑے اپنی سانسوں میں شعلے لے کر ساری دُنیا کا چکّر لگاتے ہیں اور چاند چاندی کی سلیج گاڑی میں گھومتا ہے۔ لاکھوں کروڑوں سال سے یہ گھوڑے اور ریچھ تھکے نہیں ہیں۔ تھکیں بھی تو سُستانا اپنے بس میں کہاں؟

مَیں بھی تو تھک گیا ہوں، مَیں بھی سورج جتنا بوڑھا ہوں اور چاند جتنا پھیکا۔ پھر بھی سُستانا ممکن نہیں، ہم سب خلا میں گردش کرتے ہوئے اجسام ہیں، ایک بار جس رفتار سے دھکیل دیا گیا، اسی رفتار پر چلتے رہے۔ نہ رُک سکتے ہیں نہ مدار سے باہر نکل سکتے ہیں۔ راستہ ہی راستہ ہے منزل نہیں۔ لان میں سفید گلاب کی جھاڑی ہے، پھول اس میں لدے رہتے ہیں لیکن ہر پھول ایک سوالیہ نشان ہے ہر پھول پوچھتا ہے "روتو نہیں رہے ہو؟" مَیں کیا جواب دوں، میری آنکھیں بہت گہری ہیں۔ وہ اندر ہی اندر دیکھتی ہیں۔ کیونکہ دنیا ہی بھی تو اندر ہی بچی رہتی ہے۔ مَیں روتا نہیں خوف کی وجہ سے آنسو اندر ہی اندر سوکھ گئے ہیں۔

ایک خوفناک عورت میری بغل میں سوئی رہتی ہے، اس کا پیلا چہرہ اور خاموش آنکھیں دیکھ کر میرا دل بہت گھبراتا ہے۔ اس کمرے اور ڈبل بیڈ پر وہ پورے اختیار سے قابض رہتی ہے۔ وہ میری کوئی نہیں لیکن اس گھر کی مالکن اور میرے تین بچوں کی ماں ضرور ہے۔ تینوں لڑکے میرے ہم شکل ہیں جب وہ

مجھے گھورتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ میرے کارٹون مجھ سے مخاطب ہیں۔ نہیں میں پاگل نہیں بس خوفزدہ ہوں۔ وہ جب بھی مجھ سے بات کرتے ہیں میں فوراً جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ انھیں تھما دیتا ہوں۔ مجھے پتہ ہے کہ وہ مجھ سے صرف اس کی ہی توقع رکھ سکتے ہیں۔

یوں میں ایک باوقار مہذب شخص ہوں۔ بہترین سوٹ، میچنگ ٹائی، لانبا قد، بھرا بھرا جسم، اونچی پوزیشن، بڑا عہدہ، پارٹیاں اور بے حد معروف دفتری معمول۔ بس اتنا ہی ہے کہ گھر والوں کے ساتھ بہت کم بیٹھتا ہوں۔ میں سراب سے خوفزدہ ہوں جو رگِ جاں سے قریب ہے یا اس حقیقت سے جو اتنی بیگانی ہے کہ جیسے میرا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں۔

میری آنکھوں میں جلن ہوتی رہتی ہے۔ کبھی ایک بھیانک دھندلکا بھی پھیل جاتا ہے۔ میں بار بار آنکھیں ٹسٹ کرواتا ہوں اور دل کا چیک اپ کرواتا رہتا ہوں۔ "آپ کو کچھ نہیں" ڈاکٹر کی مہربان آواز کہتی ہے۔

"میرے سینے میں کچھ اٹکا اٹکا سا لگتا ہے۔ میں ٹھیک طرح سانس بھی نہیں لے پاتا۔"

"یہ آپ کا وہم ہے مسٹر سراج۔"

اس کی آواز میں لمبی چوڑی فیس کی وجہ سے عجیب سی نرمی ہے لیکن وہ مجھے سنکی سمجھتا ہے۔

"وہم" وہم ہی تو حقیقت ہے۔ ساری دنیا ہی حلقۂ دامِ خیال ہے یہ خواب و خیال ہی تو ہے کہ میں کبھی صبا سے ہر روز ملتا تھا کبھی میں واقعی جیل گیا تھا مہندی کی باڑ کے اس پار سرمئی دوپٹے کے ہالے میں وہ کون تھی۔ صبا یا بادِ صبا کا جھونکا یا صرف وہم۔ وہ تیر جس کی نوک دل میں ٹوٹ کر رہ گئی ہے وہ کبھی نکلے گا نہیں لیکن کارڈیوگرام میں بھی آ نہیں پائے گا۔

وہ اوائلِ شباب کے ہنگامے بھی کیا ہنگامے تھے۔ ان کی یاد بھی کیسی بکھری بکھری سی ہے۔ جیسے کوئی پرانی دھول بھری ڈائریوں کو جھاڑ کر پڑھے۔ اُنیس سال کی عمر میں انقلاب ایک مہکتا خواب تھا۔ موت ایک نغمہ اور جیل یاترا ایک سعادت ہم خود کو دنیا کا نجات دہندہ اور انسانیت کا مسیحا سمجھتے تھے۔ زندگی کی قیمت ہماری نظر میں راستے کی دھول سے بھی کم تھی۔ سریندر نے مرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ وہ پولیس کی نظر میں آ چکا تھا۔ خاموشی سے دیسی طمنچے کی گولی چلی اور ہم سب رو پڑے۔ کیسا جوش تھا کیسا سحر۔ آبا جی لکھ پتی تاجر تھے اور میں کالج کے انقلابی گروپ کا لیڈر۔ راز دار تھی وہی سہمی سہمی سی صبا۔ امّی جان اور خالہ جان کو نانا جی کی طرف سے ملی ہوئی دونوں کوٹھیاں برابر برابر تھیں درمیان میں صرف مہندی کی باڑ تھی۔

مہندی کی باڑی کے اس پار ایک فکر مند چہرہ میری راہ دیکھتا تھا۔ خفیہ میٹنگوں اور اجلاسوں میں شرکت کا لازمی نتیجہ تھا گرفتاری اور جیل۔ صبا میرے لئے فکر مند رہتی تھی۔ صبا اور میں ساڑھے پانچ بجے اُٹھ کر اپنے اپنے لان میں ٹہلا کرتے تھے۔ مَیں روز صبح اُسے سفید گلاب کا ایک پھول دیتا تھا۔ وہ گلاب کی جھاڑی نہیں بلکہ جنگلی گلاب کی بیل تھی جو لوہے کے سائبان پر چڑھی ہوئی تھی۔ مجھے سفید گلاب سے عشق تھا۔ عاج کا سا بے داغ رنگ اور تہہ در تہہ کھلتے ہوئے اسرار۔ صبا بھی تو ایسی ہی تھی جیسے کہ بادِ بہار کا ایک جھونکا، صدف میں رکھا ہوا سچّا موتی یا کھلنے کیلئے بے قرار سفید گلاب کی کلی۔ مَیں جیل چلا گیا اور یہ سب جو معمول تھا اصلیت میں دُور سے دُور ہوتا چلا گیا۔ جیل کے دو برسوں میں کیا کیا ہوا۔ اب کہاں تک یاد کروں۔ بس یہ یاد ہے کہ وہاں بھی ساڑھے چار بجے آنکھ کھُل جاتی تھی۔ مَیں پاگلوں کی طرح خلاء میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہتا۔ جلد ہی تصور کی جنت بھی چھن گئی۔ اعجاز بھائی کے ذریعے پتہ چلا کہ صبا کی شادی راشد سے ہو گئی اور وہ ترکِ وطن کر کے انگلینڈ چلی گئی۔ مَیں پتھر بنا سنتا رہا۔ ایک اکیس سال کا لڑکا اور جیل میں بند قیدی کر ہی کیا سکتا ہے۔ اس کے بعد پھر کبھی حالات کے دھارے کے خلاف جدوجہد بھی نہیں کی۔ پورے معاشرے میں ایک فرد کی اہمیت کیا ہے۔ یوں زبردستی تو کوئی نہیں کرتا لیکن راستے پہلے سے ہی مقرر ہوتے ہیں جن سے کوئی مفر نہیں ہے۔

اب وہ فکر مند اور دعا گو آنکھیں کہاں تھیں انگلستان کا کہر موتیا بندین کر ان میں سما چکا تھا۔ جیل سے نکلا تو سیاست سے بھی توبہ کر لی۔ ایم۔ اے کیا۔ اسی دوران ملک آزاد ہو گیا اور جیل یاترا ایک قابلِ فخر بات بن گئی۔ مَیں نے مقابلے کا امتحان دیا اور پھر وہی سارے راستے سامنے بچھ گئے جو پرانی نسل نے ہمارے لئے تیار کئے تھے۔ مَیں انسان تھا یا روبوٹ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ حالہ کو دنیا نے میرے ڈبل بیڈ پر لا کر بٹھا دیا۔ وہ خود کو میری بیوی سمجھتی رہی لیکن مَیں نے اسے دو ٹکے کی بیسوا سے زیادہ اہمیت نہیں دی۔ وہ اپنا جسم مجھے بیچ کر تین لڑکوں کی ماں بنی اور مَیں قیمت میں اپنی ساری تنخواہ اسے دیتا رہا۔ دفتر میں، کلب میں، گھر میں ایک عجیب سا انتظار رہتا ہے۔ شاید یہ خواب ہو اور جب آنکھ کھلے تو وہی پرانی کوٹھی ہو، وہی مہندی کی باڑ۔ مَیں جانتا ہوں یہ غم نا یافت ہے۔ اگر وہ مل جاتی کچھ بھی خاص نہ ہوتا۔ لیکن اب یہ لگتا ہے کہ ہَوا کا جھونکا میری مٹھی سے سر سر نکلتا چلا گیا۔ کس سے فریاد کروں۔ مَیں نے ہَوا کو قید ہی کیوں کرنا چاہا تھا۔ یہ تو مَیں ہی جانتا ہوں کہ یہ کوئی نشتر ہے، خنجر یا ہوا کا ملبس جو سینے کے قفس میں قید ہے۔ رہ رہ کر دل میں گونج سی پیدا کرتا ہے۔ کبھی یہ جاننے کی ضرورت نہ سمجھی کہ صبا کا کیا ہوا۔ مجھے یقین ہے کہ دنیا نے ہاتھ پکڑ کر جس راہ پر ڈال دیا وہ اسی پر چلتی گئی وہ مجھ سے

پہلے ہی جان گئی تھی کہ آہ وزاری کرنے کے بدلے گا کچھ نہیں صرف آواز بیٹھ جائے گی۔ اب تو شاید صراطِ مستقیم پر چلنے کا غرور ہو آنکھوں میں یہ صراطِ مستقیم میں صراط ہے۔ دائیں بائیں مت جھانکو۔ ذرا بھی چوکے کہ مہیب شعلے نکل جائیں گے۔

زندگی میرے لئے دھوپ چھاؤں کا کھیل تھی۔ اصلیت اور خوابوں کے تانے بانے آپس میں گڈمڈ تھے۔ ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ جلتی بجھتی یادوں سے گھبرا کر میں ایک بڑے شہر میں آ بسا۔ کل معروف بھائی سے پتہ چلا کہ صبا کے انتقال کو دو مہینے گذر چکے ہیں وطن میں سب کو پتہ تھا۔ خالہ جان کو ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ اعجاز بھائی اور خالو انگلینڈ چلے گئے تھے۔ اور میں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں کیا کرتا رہا۔ یادِ صبا جلتی رہی، سفید گلاب کھلکھلاتے رہے۔ ہوا کے کسی جھونکے نے نہیں بتایا کہ جانِ جہاں کہر کے سمندر میں ڈوب ہی گئی۔

کاروبارِ زندگی چلتا ہی رہا کہیں بھی کچھ نہیں بدلا جیسے کچھ نہیں ہوا۔ یہ صالحہ میرے لئے ناشتہ تیار کرتی رہی اور ٹفن پیک کر کے دیتی رہی، کپڑے پریس ہوئے ملتے رہے۔ دھیمے سُروں میں ریکارڈ بجتے رہے۔ یہ بھی تو ایک افسردہ سا گیت ہے۔ نہ جانے کس نے لگا لیا ہے۔

"شامِ غم کی قسم آج غمگیں ہیں ہم"

کیسا عجیب سا گیت ہے غمگیں ہونے کا یقین دلانا تو دُور کسی کو رازدار بنانا بھی بد دیانتی ہوتا ہے۔ "آج" غمگیں ہونے کا کیا کہنا۔ آج کچھ نیا نہیں ہے۔ نیا تو صرف پچھتاوا ہے۔ ایک بے کراں خلا ہے۔ نہ کوئی انتظار ہے نہ آسرا۔ میں نے اس کے آخری الفاظ بھی نہ سنے۔ ایک بار دیکھ تو لیتا کہ وہ سرکش گیسو برف باری کے بعد کیسے لگتے تھے۔ اس نے اپنا حسن اور اپنی ادائیں اپنی اولاد میں کیسے تقسیم کیں ان آنکھوں میں انتظار کی جوت کیسے بجھی۔ زندہ رہنے کا تاوان اس نے کس کس طرح ادا کیا سفید گلاب کی ادھ کھلی کلی خزاں کے بعد کیسے دھول میں ملی۔

ان سالوں میں کئی بار انگلستان جا سکتا تھا۔ وہ بھی خالہ جان کے پاس آتی رہی۔ میں اپنی صلیب پر چڑھا اپنے ہی تاج کے کانٹے گنتا رہا۔ لیکن ساتھ ہی کوئی اور بھی مصلوب تھا۔ یہ آج بلال کے جنازے میں شرکت کر کے محسوس ہوا۔ کبھی کبھار مبہم سرگوشیاں سُنی ہیں کچھ طنزیہ فقروں کا بھی کانوں کو احساس ہوا ہے۔ بلال صالحہ کے ماموں کا بیٹا تھا جو یتیم اور یسیر ہونے کے بعد لاوارث کی حیثیت سے ان کے گھر پلتا رہا۔ صالحہ کی خاموشی اور چہرے کی زردی میری بے رُخی کا نتیجہ تھی یا کوئی اور وجہ بھی تھی۔ میں تو اسکی دُنیا میں رہتا ہی نہیں تھا۔ دُنیا نے اسکے راستے میرے گھر سے جوڑ دیئے اور وہ بھی ساری زندگی ایک پُل صراط پر ہی چلتی رہی جس

ہیں دونوں طرف جہنم کے شعلے ہیں۔ اسے مجھ سے دلچسپی تھی یا نہیں کون جانے کھانا وہ بناتی کسی اور کے لئے تھی اور رکھنا اسے میرے ناشتے دان میں پڑتا تھا۔ ناشتہ وہ کسی اور کے لئے بناتی لیکن اس کی پلیٹ میرے سامنے رکھ دیتی۔ کپڑے وہ کسی اور کے پریس کرتی لیکن میں پہن لیتا۔ کیا وہ بھی سوچتی رہی کہ زندگی گزر تو رہی ہے لیکن ایک دوسرا انداز بھی ہو سکتا تھا۔

دولت ایسے ایسے کولر اور اے سی خرید لیتی ہے کہ مشینی ہوائیں بادِ صبا کو اڑا دیتی ہیں گلاب کی خوشبو مر کر کہرے میں دفن ہو جاتی ہے اور بلال۔ وہ خاموشی سے بجلی کے سامان کی دوکان کھول لیتا ہے۔ کچھ سالوں سے وہ بڑا سیٹھ بن گیا تھا۔ راستے گلی میں کبھی کبھار ملتا اور بڑی گہری آواز میں ایک ہی سوال پوچھتا۔

"بھائی صاحب گھر میں سب خیریت تو ہے"

میرا بے روح اور بے معنی جواب ہوتا "جی ہاں آپ کی دعا ہے" میں اپنے گھر والوں کو جانتا ہی کہاں تھا۔ آج پہلی بار صالحہ کو دیکھ رہا ہوں کہ اس کا رنگ اتنا پیلا کیوں ہے۔ چہرہ اتنا بے تاثر اور آنکھیں اتنی خاموش کیوں ہیں۔ پوری کہانی تو پتہ نہیں البتہ اندازہ ہے کہ اب اونچے گھرانوں میں بزالوں کو شامل نہیں کیا جاتا۔ امیر و کبیر ماں باپ کو صالحہ اور بلال میں کوئی مناسبت نظر نہیں آئی ہو گی اور خدا جانے کیوں ہمیں ایک دوسرے کے لئے مناسب سمجھا گیا۔ اور میں اور صالحہ ایک دوسرے کی بیساکھی بنا دیئے گئے۔ میں تنخواہ کا لفافہ تھا اور وہ شاید طوائف۔

بادِ صبا اپنے خوابوں کے تعاقب میں چلی گئی اور بلال بھی نہ رہا۔ اب بس میں اور صالحہ باقی ہیں۔ ڈائننگ ٹیبل پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے کیوں کہ کھانا بھی فرائض میں شامل ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اسے نظر انداز کرتا رہا۔ اور دراصل اس نے کبھی میری طرف غور سے دیکھا ہی نہیں پانی کا گلاس دیتے ہوئے اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں آ جاتا ہے اور میں اس کے ہاتھ کو زندگی میں پہلی بار پوری شدت سے دبا لیتا ہوں۔ اس کی خاموش آنکھیں آنسوؤں کے سمندر میں ڈوب جاتی ہیں۔

میں اس کے ہاتھ پر اپنا سر رکھ کر برسوں بعد چیخ چیخ کر رونے لگتا ہوں سیکڑوں ہچکیاں اور سسکیاں مجھ پر قرض ہیں اور آج قضائے عمری ادا ہونے کا دن ہے۔۔۔!

○○

# گونجتا ہُوا سوال

نربدا نے کبھی سوال نہیں کئے تھے۔ زبان تک تو بہت سے سوال آئے لیکن ہونٹوں نے ان کو اندر ہی دھکیل دیا تھا۔ اور اب اس دروازے کے باہر وہ ایک سوال چھوڑ آئی تھی جواب جو بھی ہو اب وہ نہیں ہارے گی۔ ہارنے اور جیتنے کی کشمکش کا اب انت ہو چکا تھا۔

سوال اس نے اس وقت کیوں نہیں پوچھا! جب ماں اور ماموں نے اسے بی۔ ایڈ کرنے سے پہلے ہی کالج سے اٹھا کر پھیروں کے لئے بٹھا دیا تھا۔ ماں نے ایک چھوٹے سے گھر کی بساط پر اس کی پرورش کی تھی۔ اس کا آدھا حصّہ کرایہ پر اُٹھا دیا تھا۔ مکان کے سہارے ماں اپنی بیوگی کا کرب جھیل گئی اور نربدا نے بی۔ اے پاس کر لیا۔ بی۔ ایڈ میں ایڈمیشن بھی مل گیا تھا لیکن ماموں نے پربھو دیال کا رشتہ بتا دیا۔ پانچ اور سات سال کے بے ماں کے بچّوں اور پینتیس سال کے پربھو کے لئے غریب اور یتیم لڑکی نربدا سب کو مناسب لگی۔ بات طے ہوتے ہی اس کا کالج جانا بند ہو گیا اور نربدا سُرخ ساڑی پر آنسو بھری آنکھوں سے سلمہ ستارا لگانے لگی۔ نربدا نے دل میں گھٹتے ہوئے سوالوں کا منہ بند کر دیا۔

پربھو دیال کی ماں کو نربدا بہت پسند آئی۔ اس کی بے زبانی اور خاموشی ماں کے تیز مزاج کے عین مطابق تھی۔ پربھو کی اسٹیشنری کی دوکان تھی۔ وہ بی اے پاس تھا۔ کچھ ماں کے پاس موجود تھا کچھ ماموں نے حصّہ بٹایا اور سیدھے سادے طریقے سے شادی ہو گئی۔ اس کے بعد شروع ہوا بوجھل، گرم اور بے کیف دنوں کا سلسلہ۔ اگر آشو اور سُورج نہ موجود ہوتے تو نربدا اس خاموشی کی گٹھری میں کچھ اور سوال باندھ لیتی لیکن دونوں کی آنکھوں کا سہما پَن اس کی آنکھوں کو نم کر دیتا۔

وہ اپنے پیار سے انھیں قریب کرنا چاہتی تھی لیکن ساس کی کڑی نگاہیں روک لیتیں۔ سوتیلی ماں ہو کر وہ دادی سے زیادہ پیار کرے یہ کہاں کی ریت ہے۔ اسکول سے واپسی پر انھیں صاف کپڑے، عمدہ کھانا، ٹھنڈا پانی اور تھوڑا سا پیار دے کر وہ ساس کو ناراض ہی کرتی تھی۔ ان کا ہوم ورک کروانے میں اسے مزہ آتا تھا۔ یہ ساس کو اچھا نہیں لگتا۔ نربدا کو کسی بات میں مزہ کیوں آتا ہے۔ اس کی زندگی کا جام تلخی سے لبالب بھرا ہونا چاہئے۔ جھاڑو دیتے، جالے صاف کرتے، کپڑے دھوتے اور برتن مانجھتے ہوئے وہ بار بار سوالات کے ہجوم کو پرے دھکیلتی رہتی لیکن سوالوں کے آسیب گھوم پھر کر پھر واپس آجاتے۔

نربدا کے گن ساس کے لئے چیلنج بن گئے۔ وہ کھانے کو بد مزہ بتا کر بچوں کو ڈانٹ کر بلا کار روک ٹوک کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالتی رہتی۔ نربدا کو اس سے اتنی پریشانی نہ ہوتی جتنی پربھو کے حیوانی پیار سے۔ اس کی نظر میں وہ ہمیشہ ایک جلّاد اور زانی ہی بنا رہا۔ جسمانی تعلّقات کو وہ شوہر کا حق اور بیوی کا قرض سمجھتا تھا۔ نربدا اپنے آپ سے بھی اپنی نفرت چھپاتی اور اپنی ہڈّیاں پیس کر اس گھر میں ملا دینا چاہتی تھی۔ کیوں کہ پرائے گھر کو اپنانے میں اپنی ہستی تو مٹانا ہی پڑتی ہے۔ لیکن تب ہی نربدا کو لگا کہ اب اس گھر میں اس کا رل جانا آسان ہو گیا ہے کیونکہ اندر باہر دونوں طرف سے وہ پربھو کی ہو گئی ہے جب وہ ماں کے پاس گئی تو دادی نے بھی تصدیق کر دی۔ اب اسے کوئی سوال نہیں پوچھنا تھا۔ سب سوالوں کا جواب ملنے والا تھا بالوں میں گجرا لگاتے لگاتے اس کے ہونٹوں پر مطمئن مسکراہٹ آگئی۔ اب انشو اور سورج کا ایک اور بھائی یا بہن آئے گا۔ اس نے رکتے رکتے پربھو کو بتایا۔

لیکن سنتے ہی پربھو کا چہرہ سیاہ ہو گیا۔ اس نے چیخ کر ماں کو آواز دی۔ کسی انہونی ڈر سے نربدا کا دل کانپ گیا۔ جوڑوں کا درد بھول کر ماں دوڑ کر آئی اور حیران اور پریشان نربدا کو انھوں نے جلدی جلدی کھدیڑ کر باہر نکال دیا۔ نربدا پھٹی آنکھوں سے سب دیکھتی رہی۔ اس نے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ رات کے دس بجے دو میل پیدل چل کر وہ ماں کے پاس آگئی۔ ماں کے سوالوں کے جواب میں اس کے پاس بھی سوال ہی تھے لیکن وہ آنکھوں تک ہی رہے۔

دوسرے دن ماموں پربھو سے ملے۔ پتہ چلا کہ پربھو نس بندی کروا چکا ہے۔ یہ بچہ کہاں سے آگیا۔ اس نے نس بندی کی بات چھپا کر شادی کی تھی۔ ماموں نے پربھو کے ڈاکٹری معائنہ کی بات اٹھائی لیکن نربدا نے اب اپنی بند زبان کھولی۔

"ماما جی اب میں کبھی وہاں نہ جاؤں گی چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔" نربدا اتنا بول کر ہلکی ہو گئی۔
ماموں، ماں اور نربدا تینوں کے منہ پر کالکھ پُت گئی۔ عدم پیروی کی وجہ سے ایک طرفہ طلاق کا فیصلہ ہو گیا۔ نربدا نے اس دوران بیٹے کو جنم دیا۔ دیکھنے والے حیرت زدہ رہ گئے۔ وہ ہو بہو پربھو کی تصویر تھا۔ ماموں نے پھر سے بات اٹھانی چاہی پر نربدا نے منع کر دیا۔ اس نے بی۔ ایڈ میں داخلہ لے لیا کشتی کو حالات کے دھارے پر ڈال دیا۔ وہ جانتی تھی جب ہم کچھ نہیں کر سکتے تو صرف انتظار کرتے ہیں۔ یہ بھی ایک بڑا کام ہے۔ ماں اور بیٹے کے ساتھ وہ جنوبی ہند نوکری کرنے چلی گئی۔ بادبان گرا دینے پر بھی کشتی موجوں کے سہارے چلتی رہتی ہے اور کہیں نہ کہیں جا لگتی ہے۔ دھیرے دھیرے وہ پُرسکون ہو گئی اسے لگنے لگا کہ پربھو کے گھر گزرا ایک سال ایک بھیانک خواب تھا۔ انھیں اپنی ماں کی دیکھ بھال کر کے اپنے بیٹے وشواس کو اپنے سنسکار دے کر وہ بہت مطمئن تھی۔ ایک پرانی کتاب میں اس نے پڑھا تھا، صبر اور اُمید قائم رکھنا چاہئے کیونکہ ایک دن سب مصیبتوں کا علاج ہو جاتا ہے یا ان کی تلخی رگ و پے میں پیوست ہو کر ہر زہر کو قابلِ قبول بنا لیتی ہے۔

ماں نے دبی زبان سے نربدا کی دوسری شادی کا ذکر کیا لیکن نربدا کو پربھو کا جونک جیسا لمس یاد تھا اس کے علاوہ وہ وشواس کا وشواس کیسے توڑ سکتی تھی۔ یوں دھیرے دھیرے پُرسکون سمندر میں اس کی نیّا ڈولتی رہی۔ اگر ساحل نہ تھا تو بھنور بھی نہ تھا۔

ماموں کے خط آتے رہتے۔ پتہ چلا کہ پربھو نے تیسری شادی کر لی ہے۔ اب آپریشن کی بات کھل چکی تھی۔ تیسری شادی کے لئے اس نے ستائیس سالہ بیوہ کو چُنا۔ نربدا نے شادی کی خبر سکون سے سنی۔ اسے ڈر بنا رہتا کہ پربھو اپنے بیٹے کو نہ مانگ بیٹھے۔ اب یہ ڈر ختم ہو گیا۔

کچھ دنوں بعد ماموں خود آ گئے۔ آگرہ سے اوٹی کا سفر آسان نہیں تھا لیکن ماموں اپنی خوشی اور حیرت سنبھال نہیں پا رہے تھے۔ نربدا کو پہلے ہی اندازہ تھا۔ شادی کے تیسرے مہینے میں سادھنا کے پاؤں بھاری ہو گئے۔ اب تیسری بیوی کو گھر سے نہیں نکالا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹری معائنہ کرانا ہی پڑا۔ پتہ چلا کہ جلدی جلدی میں کیا گیا آپریشن ناکامیاب رہا تھا اور پربھو اولاد پیدا کرنے قابل تھا۔

ماں اور ماموں نے کبھی نربدا پر شک نہیں کیا تھا اور اب نربدا کی بے گناہی ثابت ہو چکی تھی۔ ماموں نے وشواس کے لئے گزارا دینے کی بات کی۔ لیکن نربدا نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ اب ان باتوں کا کیا فائدہ۔ ماں اور نربدا ماموں کے گھر چھٹیوں میں آئیں۔ چار سال کا وشواس بھی ساتھ تھا۔ چھوٹے شہر کے راستے گلی میں لوگوں سے مڈبھیڑ ہو ہی جاتی ہے۔ ایک بار اس نے بازار میں پربھو کو

دیکھا۔ پیچھے سادھنا تھکے تھکے قدموں سے چل رہی تھی۔ پربھو اسے اور وشواس کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ زبیدا اسے یوں دیکھ رہی تھی گویا آر پار دیکھ رہی ہو۔ زبیدا کو حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اسے کیسے برداشت کرتی رہی۔ وہ اپنی کلف لگی ساڑی میں ایک سربلند عورت کے انداز میں کھڑی ہوئی تھی۔ سادھنا سر سے پاؤں تک روندی ہوئی ہستی تھی۔ بڑھا ہوا پیٹ، پیروں پر ورم اور گندی ایڑیاں۔ زبیدا نے اس پر ایک نگاہ غلط انداز میں ڈالی اور آگے چل دی۔ وشواس نے بدیسی لہجے والی انگریزی میں پوچھا "یہ کون ہیں اور ہمیں کیوں گھور رہے ہیں؟" وہ جنوبی ہند کے کانونیٹ میں پڑھنے کی وجہ سے انگریزی میں ہی بات کرتا تھا۔

زبیدا کا جواب تھا "ہوں گے کوئی، میں نہیں جانتی۔"

پربھو کا سیاہ چہرہ دیکھ کر وحشی درندے کی طرح غراتا ہوا پربھو اسے یاد آیا۔ وشواس کے آنے کی خبر سن کر اس نے زبیدا کو نکالتے میں پندرہ منٹ بھی نہیں لگائے تھے۔ آج زبیدا کی نظر میں اس کی قیمت راہ میں پڑے کنکر جتنی بھی نہیں تھی۔

زبیدا پھر اوٹی لوٹ گئی۔ وہ گہرے سکون کا احساس کرتی اور پل پل بڑھتے وشواس کو بڑھتا دیکھتی رہتی۔ اسے ماموں کے ذریعے پتہ چلتا رہتا کہ پربھو کے یہاں کئی لڑکیاں ہو گئی ہیں۔ پربھو ایک بڑا دوکاندار اور پرنٹنگ پریس کا مالک بن گیا۔ زبیدا بھی ترقی کرتی گئی۔ ماں کی بیماری اور کمزوری بھی پیچھے چھوٹ گئی۔ دونوں عورتوں نے مل کر وشواس کے سر پر سائبان تان دیا۔ اسے کڑی دھوپ کا احساس بھی نہ ہوا۔ سکون نے زبیدا کی عمر کے سامنے فصیل باندھ دی۔ اڑتیس سال کی ماں اور پندرہ سال کا بیٹا۔ اب وہ ایک دوسرے کا سہارا تھے۔ لڑکھڑاتا اور رگمناگی بیتی باتیں بن گئی تھیں۔ اب زبیدا کو اپنی جھولی میں سے کوئی سوال نکالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ سبک رفتار کشتی کا یہی بادبان تھا اور یہی روشنی کا مینار۔ وشواس جو کہ زبیدا کیلئے سچ مچ ہی وشواش تھا۔

اترتے سورج اور ڈھلتی دھوپ کی یہ بیلا اتنی خوبصورت تھی کہ زبیدا کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ اسی کی زندگی ہے۔ عزت، مرتبہ، خوبصورت گھر، جوان ہوتا ہوا بیٹا اور پیار لٹانے والی ماں۔ زندگی کتنی بھرپور تھی۔ ماں دونوں کے کپڑے سلتیں، سوئٹر بنتیں، اچار ڈالتیں، پچھواڑے کی کیاریوں میں سبزیاں اگاتیں۔ پر فضا پہاڑی مقام پر تینوں کی صحت عمدہ ہو گئی تھی۔ جب وہ اپنے آپ کو اتنے میں دیکھتی تو کبھی کبھی اس کی آنکھیں باہر دیکھنے کے بدلے اندر دیکھنے لگتیں۔ اسے لگتا کہ کوئی گدھ جھپٹا مار کر اس کا سب کچھ چھین نہ لے۔

ایک دن اس کے سارے اندیشے مجسّم ہو گئے۔ جب وہ گیٹ میں گھسی تو باہر آسمانی کار دیکھ کر کچھ ڈری سی گئی۔ اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ ڈرائنگ روم میں جو بھاری بھرکم آدمی بیٹھا تھا وہ جیسے کمرے میں سما نہیں رہا تھا۔ بہت موٹا ہو گیا تھا پربھو۔ پھر بھی پہچانتے دیر نہیں لگی۔ نربدا نے اُڑتی ہوئی نظر سے دیکھ ہی لیا۔ ماں اور وشواس بہت گھُل مل کر بات کر رہے تھے۔ اس کے بدن سے ٹھنڈا پسینہ بہنے لگا اور اس کی زبان بند ہو گئی۔

پربھو نے ہی پہل کی "تم تو بالکل ویسی ہی ہو۔"

اندھیرے میں اسے راستہ مل گیا۔ "ہاں لیکن تم بدل گئے ہو۔" اس نے حقارت سے کہا "کہو کیسے آنا ہوا۔"

ماں اور وشواس اسے عجیب انداز سے دیکھ رہے تھے۔ لگتا تھا دونوں نے اسے اپنا لیا تھا۔

"نربدا جو تمہارے ساتھ ہوا اب اس کی بھرپائی کوئی نہیں کر سکتا۔" پربھو نے ہمت بٹور کر بات شروع کی۔ "مجھے معافی مانگنا تو نہیں چاہئے لیکن امید ہے کہ تم معاف کر دوگی۔" اس کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ اسے اُمید نہیں بلکہ یقین تھا۔

اب تک نربدا سنبھل چکی تھی۔ ماں اور ماموں کی نصیحت اور کسی انجانے بوجھ سے جھکے ماموں کے کندھے اس کے ذہن میں تازہ تھے۔ اس کے بڑھتے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر بجھتی ہوئی ماں کی آنکھیں اب بھی اسے یاد تھیں۔

"نہیں معافی کیسی۔" نربدا کچھ ہنسی۔ "یہ میرے حق میں اچھا ہوا۔ آج میں وائس پرنسپل ہوں۔ نہیں تو کیں بھی۔" وار بھرپور تھا۔ پربھو کا منہ ایک بار پھر سیاہ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں جھک گئیں۔

ہمّت کر کے اس نے پھر کہا "ماں نے تمہیں بلایا ہے۔ انھوں نے تم کو معاف کر دیا۔ وہ تمہیں اپنانے کو تیار ہیں۔" اس نے امید بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ لیکن آج نربدا کا دن تھا۔

"پہاڑی راستوں پر چل چل کر شاید تمہارا سر چکرا رہا ہے۔ سوال یہ نہیں کہ انھوں نے مجھے معاف کیا یا نہیں، سوال یہ ہے کہ میں نے تم دونوں کو معاف کیا یا نہیں۔ تم خوب جان گئے ہو کہ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کر سکتی۔"

"میری پوری بات تو سن لو۔" وہ موٹا تازہ انسان گڑگڑا رہا تھا۔ "وہ نہیں رہی پانچ لڑکیاں چھوڑ کر سادھنا چل بسی۔ آشو بھی ہے اور سورج ایک حادثے میں اپاہج ہو گیا ہے۔ اب صرف وشواس۔۔۔"

"تم وشواش کا نام بھی مت لو۔ تم بھری عدالت میں اسے ناجائز کہہ چکے ہو۔ جلد ہی تم جان گئے تھے کہ تم نے میرے ساتھ ناانصافی کی لیکن تم کبھی میرے پاس نہیں آئے۔ تمہیں امید تھی کہ سوچ تمہارا وارث ہوگا نہیں تو سادھنا ایک لڑکا دے گی۔ اب شاید جو تھی شادی کرنا ناممکن ہے اس لئے تمہیں وشواس کی بات یاد آرہی ہے۔"

وشواس کے چہرے پر گھٹن دیکھ کر وہ رک گئی۔ میز پر قیمتی چیک، بہترین گھڑی اور کئی چیزیں پڑی تھیں۔ ماں بیٹے کی آنکھیں ملیں۔ بیٹے نے سر جھکا لیا۔

تو کیا یہ بازی بھی وہ ہار گئی؟ ایک نوکری پیشہ ماں کو امیر وکبیر باپ نے پھر مات دے دی؟ کچھ بھی ہو سب کچھ ہار کر وہ تیکدوش ہو چکی ہے اب کوئی اور شکست نہیں ہوگی۔ اس لٹے ہوئے گھر کو کوئی اور نہیں لوٹے گا۔

"مجھے وشواش کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ لے جاؤ اسے بھی۔ لیکن یہ ہمارے تمہارے درمیان پل نہیں بن سکتا۔ تمہارے ساتھ جا کر اسے ماں کو بھولنا ہوگا۔ میں وشواش کے بغیر رہ لوں گی لیکن آدھا وشواش، لٹا ہوا وشواش میرے لئے بیکار ہے۔"

پربھو اور وشواش دونوں کے چہرے پھر سیاہ ہو گئے۔ دراصل انسان شروع سے آخر تک اکیلا ہی رہتا ہے۔ اکیلا رہنا سیکھنا بہت سے دکھوں سے بچا لیتا ہے۔ اس نے اپنا فیصلہ ایک سوال کے روپ میں ڈرائنگ روم میں پھینک دیا۔ اور بیڈروم کا دروازہ بند کر دیا۔۔

ڈرائنگ روم میں کھڑی تینوں ہستیاں سناٹے میں ڈوب گئیں۔

OO
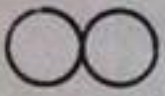
# پت جھڑ کے بعد

زندگی کی عجیب عجیب تفسیریں پیش کی جاتی ہیں لیکن میرے خیال میں ساری زندگی صرف محبت کی تلاش ہے۔ پیار کی پیاس کبھی نہیں مرتی، بلکہ فزوں تر ہوتی جاتی ہے۔ اپنی محبت کے مرکز کو ہم اپنی ذات میں شامل کر لیتے ہیں لیکن انسان کبھی صرف خود سے محبت کرنے کے قابل ہی ہوتا ہے۔ یہ خود پرستی کسی کو بھی تنگ دل بنا سکتی ہے۔

سفینہ ایسی کیوں تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے ساتھ ایسے تجربات کیوں کئے؟ اس نے اپنی ذات میں کسی کو شامل نہیں کیا وہ نرگسیت کا شکار تھی۔ اس نے جاتے جاتے میرے دل کو اتنا توڑ دیا کہ وہ کرچی کرچی ہو گیا جس طرح کہ نہ ٹوٹنے والا شیشہ جب ٹوٹتا ہے تو اس کا کچھ بھی نہیں بچتا۔ لیکن میں حیدر کا منہ دیکھ کر پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔

سب بار بار یہی کہتے رہے کہ وہ شروع سے ہی بڑی فراخ دلی اور روشن خیالی کا فائدہ اٹھاتی رہی ہر بندش سے خود کو آزاد سمجھتی رہی۔ شوہر اور بیوی ایک دوسرے کے لئے وفادار نہ ہوں یہ خیال ہی مجھے ناپاک لگتا ہے۔ لیکن یہی غلاظت میرا دامن بھی بھگو گئی تھی۔

سفینہ کا فلسفیانہ انداز محض اپنے لئے آسانی بٹورنے کا ذریعہ تھا۔ اپنے آپ کو منفرد دکھانے کی دھوم محض اپنے لئے آسانی مہیا کرنے کی کوشش تھی۔ میں ہمیشہ اسے اپنے قریب لانے جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرتا۔ ہماری شادی محبت ہی نہیں بلکہ میری دیوانگی کا نتیجہ تھی۔ یہ ایک طرفہ محبت اور دیوانگی بہت دن تک قائم رہی۔ اس لئے میں یہ دیکھ ہی نہ سکا کہ وہ کہاں جاتی ہے

اور کس سے ملتی ہے، کس کو دیکھ کر وہ کھل جاتی ہے۔ یہ سب باتیں اور ان کا تذکرہ مجھے بہت چھوٹی باتیں لگتی تھیں۔ کچھ عزیزوں کے طنزیہ فقرے بھی کانوں میں پڑے جس کو میں حسد اور تنگ نظری ہی سمجھتا رہا۔

سبک اندام اور باوقار سفینہ عام طور پر سفید کپڑوں میں ملبوس رہتی تھی۔ وہ مجھے اتنی پاکیزہ لگتی کہ میں اس سے مرعوب ہو جاتا تھا۔

مرشد کون تھا۔ وہ کیوں اتنا آتا تھا۔ میں نے کبھی دھیان نہیں دیا۔ گھر میں سفینہ اور میں ہی رہتے تھے۔ بعد میں اس کی ماں بھی آگئی جن کو میں خالہ جان کہتا تھا۔ وہ پرانے زمانے کے طور طریقوں والی ایک مقدس سی خاتون تھیں۔ وہ بہت خاموش اور تنہائی پسند تھیں۔ نہ جانے کیوں مجھے لگتا کہ وہ سفینہ کی بہ نسبت مجھے زیادہ پسند کرتی ہیں۔ ان کی خاموش محبت میری فطرت کے عین مطابق تھی۔ اسی زمانے میں پتہ چلا کہ سفینہ ماں بننے والی ہے۔ نہ جانے کیوں خالہ جان یہ سن کر ایک دم چپ ہو گئیں۔ سفینہ کی دو بہنیں اور بھی تھیں لیکن وہ دونوں مدتوں سے کینیڈا میں رہ رہی تھیں اور ان کا کوئی ہم لوگوں سے رابطہ نہیں تھا۔ میرے ماں باپ سفینہ کو سخت ناپسند کرتے تھے اس لئے اپنے قصبے سے کبھی ہمارے گھر نہیں آتے تھے۔ سفینہ کے کٹے ہوئے بال مختصر بلاؤز اور بے باک باتیں ان کے روایت پرست ذہنوں پر تازیانہ کی طرح لگتی تھیں۔ میں یہی سوچتا تھا کہ سفینہ تمام عورتوں سے مختلف ہے اس لئے کوئی اس کو سمجھ نہیں سکتا۔ کوئی اس کی خوبیاں نہیں جان سکتا۔

وقت کی ندی اپنی رفتار کبھی نہیں بدلتی۔ دادا دادی اور نانا نانی نے خیر مقدم نہیں کیا تو حیدر بھی اتنا پیارا لگا کہ میں پہلی ہی نظر میں اس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ مجھے تو یہی لگتا کہ وہ مجھے بے معیت کرتا ہے اسی لئے میں بھی اس کے پیار میں سب کچھ بھول گیا۔ اس نے ہوش سنبھالا تو ماں سے پہلے ڈیڈی ہی کہنا سیکھا۔ اس کی ننھی سی آواز میرے دل پر چڑھی اداسی کی پرتوں میں شگاف ڈال دیتی۔ میں بے اختیار اس کو اپنی گود میں لے لیتا تھا۔

ہم دونوں ہی سفینہ کی لاپرواہی اور خود پرستی کو نظر انداز کر کے ایک دوسرے میں ڈوبے رہتے۔ سفینہ ہماری محبت کو ایک طنزیہ تبسم کے ساتھ دیکھتی رہتی جیسے کسی گھٹیا سے ڈرامے کو دیکھ رہی ہو۔

اسی دوران مرشد کو ریڈیو اسٹیشن کی طرف سے جرمنی جانے کا موقعہ ملا مجھے تو یہ بعد میں پتہ چلا۔ جب سفینہ کسی نہ کسی طرح یورپ جانے کی کوشش میں لگ گئی اور کسی نہ کسی ترکیب سے ایک ورک شاپ کا دعوت نامہ منگوا ہی لیا۔

حیدر کی پیدائش کے بعد کے سات سالوں میں ہمارا تعلق کمزور ہوتے ہوتے نامعلوم سا ہی ہو چکا تھا کیونکہ جو بھی تعلق تھا وہ صرف میری طرف سے تھا۔ اور میں حیدر میں گم ہو چکا تھا۔ حیدر کے علاوہ میرا کالج اور میری ریسرچ اور کالج کی دیگر مصروفیات، میرے پاس سوچنے کا وقت ہی نہیں چھوڑتی تھیں۔ کیونکہ میں کسی دوسری عورت میں دلچسپی نہیں رکھتا تھا اس لئے نہ میں نے طلاق کا نام لیا نہ سفینہ سے شکایت کی۔ شکایت کرنے کا جواز تھا نہ فائدہ کیونکہ سفینہ ویسی ہی تھی جیسا کہ میں نے اُسے پایا تھا اور ہر ایک کی مرضی کے خلاف پسند کیا تھا۔ کچھ زیادہ جھنجھٹ کر کے میں سفینہ کی ماں اور حیدر کو تنگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور اس طرح سفینہ ہمیشہ کی طرح اچھی طرح دار ساڑیوں، نفیس زیورات اور مہذب مداحوں میں مصروف رہتی۔ ریڈیو اسٹیشن میں اس کا اعلیٰ عہدہ اس کا ایک طرۂ امتیاز تھا۔ یوں بھی میں ہمیشہ یہی سوچتا تھا کہ عورت صرف عورت ہونے کی وجہ سے مرد کو جواب دہ نہیں ہے۔ وہ خود مختار بھی۔ یہ میں یہی سوچنے کی کوشش کرتا کہ وہ جو کچھ کر رہی ہے وہ ٹھیک ہی ہے۔

اس لئے جرمنی جانے سے پہلے میں اس سے بات کرنا تو چاہتا تھا کہ میں مانتا تھا کہ یہ بات آخری اور فیصلہ کن ہوگی اس لئے اس کو ٹالتا رہا لیکن جب خالہ جان نے خود کہا کہ میں سفینہ کو روکوں تو بات کرنا ہی پڑی۔

"سفینہ" میں نے بہت دن بعد اسے مخاطب کیا تھا۔ وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگی مجھے محسوس ہوا کہ اس حیرت میں حقارت کی آمیزش بھی تھی۔ لیکن مجھے کہنا تھا تو میں نے کہہ ہی دیا "اب ہر بات صاف ہونا چاہئے۔ تمھارا جرمنی جانا بالکل غیر ضروری ہے اور میری مرضی کے خلاف بھی ہے۔ تمھیں کسی اور کی پرواہ نہیں تو کم سے کم حیدر کا خیال کرو۔" مجھے احساس تھا کہ میرا لہجہ بالکل کھوکھلا ہے۔ میں ہکلا کر کچھ اور کہنے ہی والا تھا کہ سفینہ کے بے باک قہقہے نے میرے الفاظ چھین لئے۔

اس نے طنز سے بھرپور تھیٹریکل اسٹائل میں کہا۔ "اوہ میرے بھولے شوہر یہ سوال و جواب کیسے؟ ——— میں تمھاری کوئی خریدی ہوئی عورت نہیں ہوں لیکن اگر تم بیوی سمجھ کر یہ رعب دکھا رہے ہو تو یاد رکھنا یہ رشتہ بھی گل سڑ چکا ہے۔ میں ایک خود مختار عورت ہوں۔ رہی حیدر کی فکر! تو کم سے کم تم اس کی فکر ہرگز نہ کرنا۔"

میں لاوا اُبلتے اس کے شہد رنگ ہونٹوں کی طرف دیکھتا رہا۔ "کیا تم اب بھی نہیں سمجھے؟ حیدر تمھارا بیٹا نہیں ہے۔ تم پتہ نہیں بھولے ہو یا سیدھے یا شریف، تمھاری اس حماقت آمیز شرافت نے میری زندگی کو بے نمک بنا کر رکھ دیا ہے۔ میں تم پر لعنت بھیج کر مرشد کے ساتھ جرمنی جا رہی ہوں۔ اماں اور حیدر کا میں بندوبست کر لوں گی۔"

میری رُوح تک کی بنیادیں ہِل گئیں۔ مَیں بے مدار سیارہ کی طرح خلاء میں لڑھک رہا تھا۔
اب بات کرنا بیکار تھا۔ قانوناً میں سب کچھ کر سکتا تھا لیکن اس کا بھی کیا فائدہ تھا۔ خالہ جان کی شرمندہ آنکھوں سے نظریں چراتے ہوئے مَیں نے اپنے وکیل کو فون کر دیا۔ سفینہ اپنے کمرے میں بند ہو گئی۔ گھر میں آنے والے طوفان سے بے خبر حیدر کرکٹ کھیل کر واپس آیا۔ خوشی سے اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ ڈیڈی ہم جیت گئے۔ اس کی ننھی باہیں میری ٹانگوں کے ارد گرد لپٹ گئیں۔ ایک لمحے کے لئے مجھے لگا کہ کوئی لجلجا سانپ میری ٹانگوں سے لپٹا ہوا ہے۔ مجھے کراہیت کا احساس ہوا۔ لیکن نہیں یہ حیدر تھا۔ میرا پیارا بیٹا۔ میری زندگی کی واحد خوشی۔ اس کی رگوں میں مَیں نے اپنی رُوحِ جان بنا کر دَوڑا دی تھی۔

خالہ جان کا ان کے دوپٹہ سے بھی زیادہ سفید چہرہ اور حیدر کی خوشی سے چمکتی آنکھیں میرے دل میں پیوست ہو گئیں۔

جب میری وکیل سے بات ہوئی تو وہ بے اعتباری سے مجھے دیکھتا رہا لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ مَیں اپنا لائحہ عمل طے کر چکا تھا۔

"آپ اچھی طرح سوچ لیجئے"۔ وکیل کی آواز دُور سے آ رہی تھی۔ "میں اچھی طرح سوچ چکا ہوں"۔
مجھے یقین تھا کہ سفینہ کو اس پر اعتراض نہ ہو گا۔ وہی ہوا بھی۔ وہ اپنے مہر کے پچیس ہزار لے کر چُپ چاپ جرمنی چلی گئی۔ اسے اپنی ماں اور بچے کی پرواہ نہیں تھی۔

لوگ بہت کچھ باتیں بناتے رہے کوئی اظہارِ افسوس کرتا، کوئی ہمدردی۔ میں زندگی اپنے حساب سے جینا چاہتا تھا مجھے کسی کے کہنے سننے کی پرواہ نہیں ہے۔ آزمائش کے دَور سے نکل کر میں نے سکون مہیا کر لیا۔

اس وقت شام کے پانچ بجے ہیں۔ میں چائے پی رہا ہوں۔ حیدر لنگڑا کر دوڑتا دوڑتا آتا ہے "ڈیڈی میری ٹانگ چھل گئی ہے اب میں آپ کے ساتھ بازار کیسے جاؤں گا"۔

"میں آپکو گود میں لے جاؤں گا۔ فکر کی کیا بات ہے؟"

سامنے جائے نماز پر بیٹھی خالہ جان تسبیح پھیرتی ہوئی آنسو بھری آنکھوں سے مسکرا رہی ہیں۔
کیا مَیں خالہ جان کو بے آسرا کر کے گھر سے نکال سکتا تھا؟ کیا میں ان ننھی باہوں کا حصار توڑ سکتا تھا؟ میرا خون نہ سہی اس کی رگوں میں میری رُوح دَوڑ رہی ہے۔
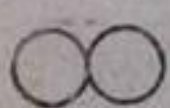
حیدر میری گود کی گرمی پا کر سو چکا ہے۔ آج میری دنیا مکمل ہے۔

○○

# احساس کا زہر

ریڈیو پر کلام شاعر بزبان شاعر پیش کیا جائے گا۔ مَیں اپنی آواز خود سنوں گا۔ زیبا میری طرف اس طرح دیکھے گی جیسے کوئی کسی دیوتا کو عقیدت بھری نگاہ سے دیکھتا ہے کیونکہ وہ میری بیوی ہونے کے ساتھ ہی ساتھ مداح بھی تو ہے اور مَیں خود اپنی جانب کس طرح دیکھوں گا؟ جیسے کوئی کسی کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے موقع پر کسی اور شاعر کا ایک مصرع ذہن میں آتا ہے۔ ع

آج اپنے سے ملے ہم تو ندامت سے ملے

ندامت کیوں ہے، مَیں کس کے آگے شرمندہ ہوں؟ معاشی تحفظ ہے۔ ریڈیو کی تقریباً مستقل ملازمت ہے۔ نفیس کوٹھی ہے اور آرٹسٹک فرنیچر سے سجی ہوئی۔ دو بچیاں ہیں۔ ایک خوبصورت اور باسلیقہ بیوی ہے۔ جو ہے اس کی تو یہ فہرست ہے اور جو نہیں ہے اُس کی فہرست کیسے مرتب کروں۔

جب میری آواز ریڈیو سے اُبھرتی ہے تو کیوں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مَیں اتنا بدل گیا ہوں۔ کس طرح ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک انسان بولتا نہیں تانبے کے سکّے کی طرح کھنکھناتا ہے اور کرنسی نوٹوں کی طرح کھڑکھڑاتا ہے۔ کس طرح ایک ایک لفظ اور چہرے کے ایک ایک اتار چڑھاؤ کی قیمت وصول کرلیتا ہے اور اس قیمت سے زندگی کی تکمیل کرتا ہے۔ زندگی کی تکمیل کیا ہے اور پیسے کی کیا اہمیت ہے یہ سمجھنے میں بارہ سال لگتے ہیں۔ بارہ سال کے عرصہ میں ایک بدحال لڑکا تیس سال کا تجربے کار مرد بن جاتا ہے۔ بارہ سال میں غلطیوں اور ناکامیوں کا پیکر انسان ایک سکّہ بن جاتا ہے۔ میرے گھر میں سُرخ قالین پر زرد اور عنابی پھول پڑے ہیں۔ ریڈیو گرام بھی ہے اور

ٹی۔ وی بھی، بے شمار پھولوں سے لدا ایک لمبا سا گلدان ہے۔ عالیشان شیلف میں اردو، ہندی اور انگریزی کی تخلیقات جمع ہیں۔ مجھے ان کتابوں سے نہ جانے کب کا بیر ہے۔ ان کو دیکھتے ہی یاد آنے لگتا ہے وہ کمرہ جس کا کل اثاثہ ایک جھلنگا پلنگ کے علاوہ صرف کتابیں ہوا کرتی تھیں۔ اکثر چائے والے اور سگریٹ والے کی دکان کے بل ادا کرنے کے لئے کتابوں کی ردی بیچنی پڑتی۔ کس طرح مَیں اپنی کتابیں باحسرت و یاس ردی میں لٹا دیتا اور پھر گھنٹوں پچھتاتا۔

نشاط ہوٹل ۔ ۔ ۔ کتنا گھٹیا قسم کا چائے خانہ تھا لیکن وہاں شاعر بھی ملتے اور شاعر گر بھی۔ دو آنے کی ایک چائے کی پیالی لے لی اور ایک میز گھیر لی۔ اور چار مینار کے دھوئیں نے فضا کو دھواں دھار کر دیا۔ دُنیا سے لڑنے کا جو اعتماد اور حوصلہ اس وقت تھا وہ کبھی لعنت اور ملامت سے بھی پست نہیں ہوتا تھا۔ وہ اعتماد اور حوصلہ اب کبھی نہیں اُبھرتا چاہے پھولوں کی کتنی ہی مالائیں پہنادی جائیں کتنے ہی جے جے کار کے نعرے لگادیئے جائیں۔

زیبا کی سوچ بھی پژمردگی میں وہ بات کہاں جو روشن دان سے جھانکنے والی اُن شریر آنکھوں میں ہوا کرتی تھی۔ پتہ نہیں کیوں انھیں دیکھ کر شوخ اور چنچل گلہری کی یاد آتی تھی۔ پیمک لگا موتی ٹململ کا ہرا دوپٹہ اور سبز مورکین کے بڑے بڑے کتھئی پھولوں والے سوٹ میں اس کا سراپا کتنا نازک اور جان لیوا ہوا کرتا تھا۔ گہری آنکھوں میں طوفانی شرارت اور ہونٹوں کی مضحکہ خیز مسکراہٹ بھی کیا چیز تھی۔ چہرے سے نیچے اتر کر جسم کے پیچ و خم تک میری نظر جاتی ہی نہ تھی۔ جب آج کل کی مردانہ لباس پہننے والی لڑکیوں کو دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ ان کے بکھرے ہوئے روکھے بالوں سے اس کی سرکش موٹی سی چوٹی کا کیا مقابلہ کروں۔ شوخی اور شرم سے اٹھتی گرتی پلکوں کی جلیس کا آئی لائنر سے بوجھل آنکھوں کا کیا تقابل کروں۔ آج وہ نہ جانے کہاں ہوگی اور نہ جانے اس طرح کی کتنی ہی بچیوں کی ماں بن چکی ہوگی۔ وہ تو سولہ ہی سال کی تھی جب اس کی شادی ہوگئی تھی اُس دن مجھ پر کیا بیتی۔ دن کیسا گزرا۔ رات کیسی آئی۔ آج جب سوچتا ہوں تب اس بیس سالہ لڑکے پر ہنسی آتی ہے جس نے رو رو کر تکیہ بھگو دیا تھا۔ نہ معلوم کتنی اُداس غزلیں کہہ ڈالی تھیں آج اُس سبز پرچھائیں سے جدا ہونے کا کوئی زخم، کوئی صدمہ میرے ساتھ نہیں ہے۔ مَیں جانتا ہوں زیبا سے زیادہ اچھی کوئی بیوی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن یہ وفا ہے پیار نہیں ہے۔ وہ والہانہ اور بے اختیار جذبہ اب کہیں فنا ہو گیا ہے۔ اس سبز عکس کی یاد آج دل میں اس لئے آویزاں ہے چونکہ دراصل وہ میری بے فکری کے زمانے کی تصویر ہے۔ بات کچھ ایسی ہے کہ زندگی نہ جھرنا ہے نہ سمندر بلکہ ایک گہری جھیل ہے۔ اس میں پانی نہ کہیں سے آتا ہے اور نہ کہیں جاتا ہے بس اتنا ہی پانی ہوتا ہے کہ ساری تلچھٹ نیچے بیٹھ

جائے۔ البتہ وقت کے ساتھ جھیل کے کنارے مناظر بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی اجالا اور کبھی اندھیرا۔ کبھی موت کی زردی کبھی زندگی کی سُرخی۔ ہر جھیل میں منعکس ہوتا ہے۔ زندگی کی حقیقت نہ معاشی تحفظ ہے اور نہ شہرت نہ دولت بلکہ کچھ ٹوٹے پھوٹے سپنے ہیں جن کی تلخی اور تندی اپنے رگ و پے میں اُتارتا ہوا انسان جیتا جاتا ہے۔ کبھی کبھی انسان اندر سے اتنا کھوکھلا ہو جاتا ہے کہ صرف خول باقی بچتا ہے۔ اس جھیل کے قریب جڑے ہوئے چوکھٹے میں کچھ سین ہمیشہ کے لئے جم جاتے ہیں۔ دوسرے سین آتے ہیں اور بدلتے ہیں لیکن ایک عکس ہر منظر میں موجود ضرور رہتا ہے اس کا عکس جس سے نہ مَیں نے کبھی بات کی تھی اور نہ ہی کبھی لمس محسوس کیا تھا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جو مَیں ہوں اسے دولت اور شہرت کے ایک ایک وار نے مات دے دی۔ ایک پختہ عمر کے مرد نے پھٹے پُرانے بستر پر پڑے ایک شاعر مزاج لڑکے کو مار ڈالا ہے جو ان گنت چائے کی پیالیاں پی کر اور بے شمار سگریٹوں کے مرغولے اُڑا کر اپنا شاعرانہ موڈ بحال کیا کرتا تھا۔ اب جو "مَیں" باقی رہ گیا ہوں" اس "مَیں کے لئے جذبات اور احساسات بہت دور دراز کی احمقانہ وارداتیں بن گئے ہیں۔ اب میں ایڈوانس رائلٹی، موضوع کی مقبولیت اور سیاسی تبدیلیوں کو اہمیت دیتا ہوں۔ کہیں کبھی یہ سادہ لااُبالی "مَیں" کتنا سفاک سا اجنبی بن کر نمودار ہوتا ہے کبھی کبھی جی چاہتا ہے کہ میرا سب کچھ کوئی لے لے۔ یہ زنجیریں جو خوبصورت کوٹھی اور نفیس معیارِ زندگی نے پاؤں میں ڈالی ہیں توڑ کر میں اپنے آبائی گاؤں میں پہنچ جاؤں اور دس سال کا بچہ پھر سے بن جاؤں۔

مشرقی یوپی کے گاؤں کی صبح ہے۔ آتی ہوئی گرمیوں کا زمانہ ہے۔ دھوئیں کی مانوس سی کڑواہٹ کے ساتھ ہی آموں کے بور کی خوشبو سے فضا بوجھل ہے۔ اُپلوں کے دھوئیں سے باورچی خانہ بھرا ہے۔ ننھا امّاں کے پیچھے جھول رہا ہے۔ امّاں کا چہرہ آگ کی روشنی میں سُرخ انگارہ بن کر تپ رہا ہے۔ مَیں چائے سے بھرے بڑے سے مٹی کے پیالے میں پراٹھے بھگو بھگو کر کھا رہا ہوں۔ ننھا امّاں کی چوٹی سے کھیل رہا ہے۔ بے حد وسیع و عریض آنگن میں گیہوں کا چھوٹا سا ڈھیر لگا ہے۔ ڈیوڑھی میں بھینس بندھی ہے۔ چبوترے کے نیچے امرود کا پیڑ ہے۔ ٹپ سے ایک امرود گرتا ہے۔ ننھا امّاں کو چھوڑ کر دوڑتا ہے لیکن میں پہلے ہی اٹھ چلتا ہوں۔ ٹھوکر سے چائے کا پیالہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ننھا امرود اٹھا لیتا ہے۔ امّاں میرے کان پکڑ کر پیٹھ پر دو دھموکے لگاتی ہیں "روز ایک نہ ایک برتن توڑ دیتا ہے۔ جلتی لکڑی مار دوں گی"۔

"دیکھئے لوگوں کو دیکھتے ہی آپ کا موڈ آف ہو جاتا ہے۔ آکر تھوڑی دیر بیٹھئے تو۔" میری بیوی کسمسا کر مجھے قائل کرنے کے لئے نسبتاً متین لہجے میں بولتی ہے لیکن ڈانٹ کے بدلے یہ التجا کتنی دُوری! کتنا پرایا پن ہے۔ دس سال کے مچلتے اور مار کھاتے ہوئے بچے کو میں رشک و حسد سے دیکھتا ہوں۔ مَیں جانتا ہوں کہ جب میرا پروگرام ہو اور محلے والے جمع ہوں تو میری بیوی چاہتی ہے کہ مَیں سفید بُراق پاجامہ سفید لکھنوی کُرتا پہن کر آ بیٹھوں اور سُننے والوں کی داد و تحسین فخریہ انکسار کے ساتھ قبول کرتا جاؤں۔ مجھ کو یاد آتا ہے کہ حساب کی کاپی پر لکھی ہوئی میری پہلی نظم جب ماسٹر صاحب نے دیکھی تھی تو کتنی بیتیں کھانی پڑی تھیں۔ کس طرح اسکول سے بھاگ کر کمرخوں کے پیڑوں کے جھنڈ میں چھپ چھپ کر بیڑی پینا اور شعر کہنا سیکھا تھا۔ اوٹ پٹانگ سے شعر ہوا کرتے تھے۔ ردیف و قافیہ کی حدوں سے پرے معنی اور الفاظ کے گورکھ دھندے سے باہر۔

اسی کمرخوں کے جھنڈ کے پیچھے پوکھر کے کنارے کھرنی کا پیڑ تھا جس کا تنا پتلا تھا لیکن شاخیں رسیلی زرد کھرنیوں سے لدالد بھری ہوئی تھیں۔ کتنی بار میں اس پیڑ پر چڑھ کر پتلی سی شاخیں ٹوٹنے پر پوکھر میں گرا جس پر سنگھاڑے کی بیل سے دلدل سی بنی رہتی تھی۔ میرے گرتے ہی جونکیں بلبلا کر مجھ سے چمٹ جاتیں پاپلین کی نیلی قمیض اور خاکی زین کا نیکر کیچڑ میں لت پت ہو جاتا تھا لیکن بس فکر یہی ہوتی کہ آج گھر پر دل کھول کر پٹائی ہو گی۔

لیکن اب ایسا ہوتا ہے کہ گھر پر کسی ماں سے مار کھانے کا ڈر نہیں ہوتا۔ نفیس سے غسل کے لباس میں کسی بڑے سے پانچ اسٹار والے ہوٹل کے سوئمنگ پول میں ڈرتا ڈرتا اترتا ہوں کیونکہ خود اعتمادی تو اسی جونکوں اور سنگھاڑوں سے لبریز تالاب میں ہی رہ گئی۔

مَیں کیسے بھول سکتا ہوں کہ کالج کے میگزین میں جب میری بہت ہی ابتدائی نظم شائع ہوئی تھی تو کیسے سارے ہی ساتھی مجھے "دیوداس" کہہ کر چھیڑا کرتے تھے۔ لیکن آج کیسا وقت بدل گیا۔ ہے وہی محفل جمی ہے میرے گھر پر جو اکثر ہی جمتی ہے۔ جب کبھی بھی ریڈیو یا ٹیلی ویژن پر میرا کلام پیش کیا جاتا ہے یا کوئی تقریر نشر کی جاتی ہے۔

ہمیشہ کی طرح آج بھی زیبا نے ڈرائنگ رُوم سجایا ہے۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کو جھاڑا اور پوچھا ہے۔ دونوں بچیوں کو بھولے بھولے غباروں جیسے سفید فراک پہنا دیئے ہیں۔ خود بھی ایک سنجیدہ سی ساڑی پہنی ہے۔ اسمارٹ بلاؤز، ہلکا سا میک اپ، سیاہ فیتوں والے چپل میں اس کے دودھیا پیر۔ سب ہی ہمیشہ جیسا ہے۔

محلّے والے جمع ہو جاتے ہیں۔ اچانک ریڈیو سے میری آواز اُبھرتی ہے۔ ایک نامعلوم سا احساس فخر سے اس کا سر بلند کر دیتا ہے۔ اپنی اہمیت پر نازاں ہو کر وہ تندہی سے سب کی خاطر میں جٹ جاتی ہے۔ اس کا جوش و ولولہ یاد دلاتا ہے کہ شادی سے پہلے وہ میری مدّاح بھی تھی۔ لیکن میں بھی تو اپنا خود کا مدّاح یا فین تھا۔ لیکن یہ سب پُرانی باتیں ہیں۔ اب یہ حال ہے کہ دولت نے جو کچھ بخشا ہے وہ تو سب دیکھ رہے ہیں لیکن دولت کے جلو میں جو تنگ دامانی اور تہی دستی چل کر آئی ہے وہ کوئی کیا دیکھ سکتا ہے۔ میری بھی کیا مجبُوری ہے دولت، شہرت اور نیک نامی کے حصار نے مجھے قید کر لیا ہے۔ پُرانے دن کبھی نہیں آئیں گے۔ جب فاقہ مستی کے باوجود زمانہ ہی ٹھوکر میں ہوتا تھا۔ جب میں اپنے دکھ کو پگھلا کر شعر میں ڈھال دیتا تھا۔ آج میں لفظوں اور لہجے کا اسیر بن چکا ہوں۔

بے بسری وہ نظم نشر ہو رہی ہے جسے شروع میں ایک رسالے کے ایڈیٹر نے شکریے کے ساتھ واپس کر دیا تھا۔ شاید اس لئے کہ موضوع فرسودہ تھا اور جگہ جگہ وزن اور بحر ڈگمگا رہے تھے۔ تھوڑی سی قطع و برید کے بعد میں نے اسے دس سال بعد ریڈیو کے لئے پڑھا۔ اس کے لئے اب داد و تحسین کی کوئی انتہا ہی نہ تھی۔ جب زیبا نے اسے پڑھا تھا تو کہا تھا " کتنا اچھا لکھنے لگے ہیں۔ اب آپ کی نظمیں کس قدر عام فہم اور زندگی کے قریب ہونے لگی ہیں۔" میں اُسے کیا بتاتا کہ کس قسم کی اور کس معیار کی نظم تھی۔ اب تو میں نے شعروں کی دکان کھول رکھی ہے جو اشتہار بازی اور ساکھ کے بل پر چل رہی ہے۔

بنا سجا کر معمولی سا مال گاہکوں کو متوجہ کرنے کے لئے شوکیس میں رکھ دیتا ہوں اور خوب بکری ہوتی ہے۔

○○

تخلیق کار کی فخریہ پیش کش

۱۹۸۹ء کے بہترین افسانوں کا مجموعہ

انتخاب

# افسانہ ۸۹

اس انتخاب میں ہندوستان کے نامور اردو افسانہ نگار حضرات کے ۱۹۸۹ء میں شائع ہوئے اٹھارہ افسانے شامل ہیں۔

مرتب:

انیس امروہوی

دیدہ زیب سرورق، عمدہ کاغذ اور آفسیٹ پر بہترین طباعت

قیمت صرف
**ساٹھ روپے**

تخلیق کار پبلشرز، ۷۔۴۰، فراشخانہ، دہلی ۱۱۰۰۰۶

● آج پہلی بار صالحہ کو دیکھ رہا ہوں کہ اس کا رنگ اِتنا پیلا کیوں ہے۔ چہرہ اتنا بے اثر اور آنکھیں اتنی خاموش کیوں ہیں۔ پوری کہانی تو پتہ نہیں، البتہ اندازہ ہے کہ اب اونچے گھرانوں میں بِلالوں کو شامل نہیں کیا جاتا۔ امیر و کبیر ماں باپ کو صالحہ اور بِلال میں کوئی مناسبت نظر نہیں آئی ہوگی اور خدا جانے کیوں ہمیں ایک دوسرے کے لئے مناسب سمجھا گیا۔ اور ہم اور صالحہ ایک دوسرے کی بیساکھی بنا دیئے گئے۔ میں تنخواہ کا لفافہ تھا اور وہ شاید طوائف۔

——— آج غم گیں ہیں ہم

● ایک بار اُس نے بازار میں پربھو کو دیکھا۔ پیچھے سادھنا تھکے تھکے قدموں سے چل رہی تھی۔ پربھو اُسے اور دشواشش کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ نربدا اُسے یوں دیکھ رہی تھی گویا آر پار دیکھ رہی ہو۔ نربدا کو حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اسے کیسے برداشت کرتی رہی۔ وہ اپنی کلف لگی ساڑی میں ایک سربلند عورت کے انداز میں کھڑی تھی۔ سادھنا سر سے پاؤں تک روندی ہوئی سی تھی۔ بڑھا ہوا پیٹ، پیروں پر ورم اور گندی ایڑیاں۔ نربدا نے اُس پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور آگے چل دی۔

——— گونجتا سوال

● میں لاوا اُبلتے اُس کے شہد رنگ ہونٹوں کی طرف دیکھتا رہا۔ "کیا تم اب بھی نہیں سمجھے؟ حیدر تمھارا بیٹا نہیں ہے۔ تم پتہ نہیں بھولے ہو یا سیدھے یا شریف؟ تمھاری اس حماقت آمیز شرافت نے میری زندگی کو بے نمک بنا کر رکھ دیا ہے۔ میں تم پر لعنت بھیج کر مرشد کے ساتھ جرمنی جا رہی ہوں۔ امّاں اور حیدر کا میں بندوبست کر لوں گی"۔

——— پت جھڑ کے بعد

● زندگی کی حقیقت نہ معاشی تحفّظ ہے اور نہ شہرت نہ دولت، بلکہ کچھ ٹوٹے پھوٹے سپنے ہیں جن کی تلخی اور تندی اپنے رگ و پے میں اُتارتا ہوا انسان جیتا جاتا ہے۔ کبھی کبھی انسان اندر سے اتنا کھوکھلا ہو جاتا ہے کہ صرف خول باقی بچتا ہے۔ اس جھیل کے قریب جڑے ہوئے جو کچھ ہیں کچھ سین ہمیشہ کے لئے جم جاتے ہیں۔

——— احساس کا زہر

---

۴۰۷، فراش خانہ دہلی ۱۱۰۰۰۶